مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپیے فی شمارہ سات روپیے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس. ایم. کالج. اسٹریچن روڈ. کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں. بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے. اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا.
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں.
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی.

کمیشن ۲۵٪ ہوگا. رقم پیشگی آنی چاہیے.

جلد ۱۶۲ ماہ شعبان المعظم ۱۴۱۹ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۹۸ء عدد ۶

فہرست مضامین

شذرات

ملک کی چار ریاستوں میں ہونے والے انتخابات میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو ذلت آمیز شکست ہوئی۔ گو اس دفعہ اس نے رام مندر کا نام نہیں لیا تاہم فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھانے، نفرت و اشتعال پھیلانے اور مذہبی جذبات بھڑکانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، گزشتہ نو ماہ کے عرصہ میں ہر محاذ پر اپنی ناکامی اور مہنگائی کی جانب سے عام لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے اس نے گوناگوں شوشے چھوڑے تاکہ حکومت سے ناراض اور مایوس لوگ بنیادی مسائل سے صرف نظر کر کے ہندوتوا کے جذبات میں سرشار ہو جائیں اور الیکشن میں اس کی ناکامی کامیابی میں بدل جائے۔ ملک کے سیکولر نظام تعلیم کو ہندوتوا میں رنگنے کی مرکزی وزیر تعلیم کی کوشش کا ذکر گزشتہ شمارہ میں آچکا ہے جس میں ان کو منہ کی کھانی پڑی، اس کے باوجود الیکشن سے پہلے اترپردیش میں یہ تاثر دیا گیا جس کی تائید ریاستی وزیر تعلیم کے بیان سے بھی ہو رہی تھی کہ یو۔پی کے سرکاری اسکولوں میں وندے ماترم اور سرسوتی وندنا جبراً نافذ کی جائے گی تاکہ اس کے خلاف مسلمانوں کے ردعمل سے الیکشن میں فائدہ اٹھایا جائے۔ الیکشن تک اس معاملہ میں حکومت خاموش رہی اور یہ اعلان نہیں کیا کہ اس کا کوئی حکم نہیں جاری ہوا ہے، اُدھر مسلمانوں نے اس کے خلاف بڑا شدید ردعمل ظاہر کیا جس کو قومی پریس نے "فتویٰ" کا نام دیا۔

وندے ماترم اور سرسوتی وندنا کے خلاف بیان دینے والوں میں سب سے ممتاز نام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا ہے جس کے خلاف سنگھ پریوار نے اتنی برہمی ظاہر کی کہ ان کا پتلا جلایا اور اس سے زیادہ تکلیف دہ اور پورے ملک کے لیے شرمناک بات یہ ہوئی کہ ۲۴ نومبر کو رائے بریلی میں ان کی قیام گاہ پر رات کو ان کی عدم موجودگی میں چھاپہ مارا گیا، وزیر اعلیٰ نے اس میں اپنی حکومت کے ہاتھ ہونے کا انکار کرتے ہوئے اس کی تحقیقات کا اعلان کیا تھا مگر ہفتہ سے زیادہ گزر گیا اور ابھی تک یہ بات صاف نہیں ہو سکی کہ شب خون مارنے والے کون تھے اور کس کے حکم سے آئے تھے۔ اس واقعہ سے ہندوستان اور دنیا بھر کے مسلمانوں ہی نہیں ہر شریف و معقول شخص کو جو درد

و کرب ہوا ہے وہ ناقابل بیان ہے، مولانا ندوۃ العلماء جیسے بین الاقوامی ادارہ کے ناظم ہی نہیں ملک و بیرون ملک کے سینکڑوں اداروں کے سربراہ اور سرپرست ہیں، ہندوستان اور اسلامی ملکوں سے گزر کر یورپ و امریکہ ہر جگہ ان کی شہرت و عظمت کا ڈنکا بج رہا ہے، ان کے دل میں صرف مسلمانوں کا نہیں سارے انسانوں کا درد ہے وہ ملک کو اخلاقی و روحانی بحران اور ہلاکت سے بچانے کے لیے ہر گوشہ میں "پیام انسانیت" پہونچا رہے ہیں، کیا ان خدمات کا یہی صلہ ہے؟ اس سے مولانا اور ان کے ہم مذہبوں کی توہین نہیں ہوئی ملک کی شرافت پہ داغ لگا اور اس کی رسوائی اور بدنامی ہوئی، ان آزمائشوں سے انشاء اللہ ان کی مزید سرخ روئی اور دونوں جہاں میں ان کے درجات کی بلندی کا سامان ہوگا ۲۵ نومبر کو جب یہ خبر ملی تو میں مولانا کو خط لکھ رہا تھا۔ اسی وقت اخباروں کو ایک بیان بھیجا، اسی دن ایک بجے مدراس کے لیے روانہ ہونا تھا اس لیے مولانا کی خدمت میں حاضری سے معذور رہا۔

جامعہ دارالسلام عمرآباد سے دارالمصنفین کا قدیم تعلق ہے، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مدراس جاتے تو یہاں بھی تشریف لے جاتے، ۱۹۳۸ء کے جلسہ تقسیم اسناد میں بھی شرکت فرمائی تھی، ان کا خطبہ جنوری ۳۸ء کے معارف میں چھپا تھا، دارالمصنفین کے سابق رفیق اور مشہور فاضل مولانا محمد یوسف کوکن کی تعلیم یہیں ہوئی تھی اور ہمارے موجودہ رفیق مولوی محمد عارف عمری بھی یہیں کے فارغ ہیں، غالباً انہی گوناگوں تعلقات کی بنا پر جامعہ کے معتمد اور میرے خاص کرم فرما جناب کاکا سعید احمد صاحب نے اس سال ۲۹ نومبر کو فارغ طلبہ کو سندیں دینے اور جلسہ کی صدارت کے لیے اس خاکسار کو یاد فرمایا، گو یہ میرے لیے بڑے اعزاز و شرف کی بات تھی لیکن اس کی ہمت اس لیے نہیں ہو رہی تھی کہ کہاں سید صاحب اور کہاں یہ کم ترین ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک

کاکا سعید احمد صاحب نے مولوی محمد عارف کو بھی لکھا کہ وہ مجھے لے کر ضرور آئیں، ان کی معیت کی وجہ سے یہ طویل سفر بڑا خوش گوار رہا، ہفتہ میں بنارس سے مدراس کی گاڑی دو ہی دن جاتی ہے اس لیے ہم لوگ ۲۷ ہی کو مدراس پہنچ گئے، میں نے جناب جی۔ عبدالرشید صاحب لکچرر عربی نیو کالج اور مدرسہ محمدی کے نادر کتب خانہ کے انچارج جناب عبید اللہ ایم۔ اے کو خطوط لکھ دیے تھے، یہ دونوں حضرات اور جامعہ دارالسلام کے مستعد کارکن ثناء اللہ خاں صاحب

اسٹیشن پر موجود تھے، خاں صاحب ہم لوگوں کو ملوڈی ہوٹل لائے اور جمعہ کے لیے پرسوا کم کی جامع مسجد لے گئے، عصر پڑھ کر مدرسہ محمدی کے کتب خانے کے بعض نوادر دیکھے، مغرب بعد سمندر کی سیر کو نکلے اور عشا بعد عبدالرشید صاحب کے یہاں کھانا کھایا، صبح ناشتہ کرکے ویلور کے اسلامک سنٹر گئے جس کا خاص مقصد نومسلم بچوں اور بچیوں کی بنیادی دینی تعلیم و تربیت ہے۔ سنٹر کے مہتمم عبدالجلیل صاحب اور دوسرے کارکنوں اور نومسلم بچوں سے مل کر اور سوالات کرکے بڑی فرحت ہوئی، اللہ تعالیٰ سنٹر کو شرور و فتن سے محفوظ رکھے اور کارکنوں کے حوصلے بلند رکھے، باوجود خواہش کے مدرسۂ باقیات و لطیفیہ جانے کا موقع نہیں ملا، جس کا افسوس ہے۔

عمرآباد بڑی پُرفضا جگہ ہے، پہاڑیاں اور ہر طرف ناریل کے باغ ہیں، سڑک کے دونوں طرف جامعہ کی خوش نما اور پُرشکوہ عمارتیں ہیں، جامعہ کی قدیم عمارتوں کے آس پاس کاکا صاحب اور انکے خاندان کے لوگوں کے مکانات ہیں، بڑی صفائی ستھرائی نظر آئی۔ ۸ بجے سے ایک بجے تک ۲۹ نومبر کو جلسہ ہوا، قرب و جوار کے ہزاروں آدمی شریک تھے، خاکسار نے خطاب کے بعد فارغ ہونے والے طلبہ کو سندیں اور ہونہار طلبہ کو انعامات تقسیم کیے، امین الحسن صاحب انجینیر نے اعظم گڈھ فون کرکے وانم باڑی آنے کا وعدہ لے لیا تھا، وہاں ۳۰ نومبر کی شب میں مردوں اور عورتوں کے ایک جلسہ میں "قرآن مجید کا اجمالی تعارف" کے موضوع پر تقریر کی، مولوی محمد عارف نے بھی تقریر کی، جناب منیر احمد صاحب کے مکان پر قیام رہا، طفیل احمد صاحب نے بچیوں کا قدیم تعلیمی ادارہ اور اسلامی بینک دکھایا، ان کے مشورے سے یکم دسمبر کو مدراس میں اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ دیکھا جو جماعتِ اسلامی کی مطبوعات کے ترجمے تمل زبان میں شایع کر رہا ہے، ان لوگوں کا جوش و اخلاص قابلِ ستایش ہے، عمرآباد کے جلسہ میں مولانا صبغۃ اللہ بختیاری کے فرزند اکبر ڈاکٹر محمود اللہ بختیاری سے ملاقات ہوئی، انھوں نے رات کے کھانے اور اپنا انسٹی ٹیوٹ دیکھنے کی دعوت دی، ان کے صاحب زادے اسٹیشن چھوڑنے بھی آئے، ان تمام حضرات کی خوش خلقی، مہمان نوازی، اخلاص اور ضیافت سے طبیعت بہت متاثر ہوئی۔ ۲ دسمبر کی شب میں بھوپال آئے، تبلیغی اجتماع اور دارالعلوم تاج المساجد کے جلسۂ شوریٰ میں شرکت کی، ڈاکٹر حسان، مولانا حبیب ریحان ازہری، مولانا محمد سعید مجددی، پروفیسر مسعود الرحمن ندوی اور مختار احمد صاحب ڈائریکٹر یونین بینک سے ملاقات رہی۔

مقالات

عالمِ اسلام کی سب سے عظیم اور قدیم یونیورسٹی

جامع ازہر کا شاندار علمی و دینی و سیاسی ماضی اور حال

از
مولانا ڈاکٹر حبیب ریحان خاں ندوی ازہری

"WORKSHOP ON SOCIETY AND CULTURAL IN CONTEMPORARY EGYPT لنگویج ڈپارٹمنٹ جواہر لال یونیورسٹی کے لیے لکھا گیا تھا جس کا صرف خلاصہ نصف گھنٹے میں ۲۰ اگست ۱۹۹۷ء کو سنایا گیا تھا۔"

قدیم مصری تہذیب

مصر ماقبل تاریخ سے عظیم تہذیب کا بانی ہے، مصر کی قدیم تعمیرات، اہرام و ابوالہول اور معبد الکرنک نیز دوسری تاریخی عمارتیں آج بھی نگاہوں کو مسحور کیے ہوئے ہیں، تحنیط یعنی لاشوں کو مسالہ لگا کر رکھنے کا فن مصریوں کے کمال کا ارتقا تھا، ہزاروں سال پرانی لاشیں آج بھی مصری میوزیم میں آئینۂ حیرت و تعجب اور تماشائے عبرت و موعظت بنی ہوئی ہیں، دیواروں کے نقش و نگار اور ہیروغلیفی زبان میں لکھے ہوئے اشعار اور جنگی کارنامے پینٹنگ کا شاہکار ہیں اور ہزاروں برس گزر جانے کے بعد بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ آج ہی لکھے گئے ہیں، قدیم مصری فن جراحت و طب نیز دوسرے علوم و فنون و صناعت اور تہذیب و تمدن کے دھندلے

آثار بھی اس مختصر بحث میں بیان نہیں کیے جاسکتے، دریائے نیل کی وجہ سے زراعت بڑے پیمانے پر تھی اور زمین کے سینے اور اپنے پسینے سے مصری کسان نے ہر زمانہ میں کشت زار ہستی کو سنوارا ہے اور ہر رعنائی، رونق اور بہار کا سہرا اسی کے سر پر باندھا جاتا ہے۔

ید بیضا اور جمال یوسفی

مصری قوم میں قوت دفاع اور حق کو فتح یاب کرنے کا جذبہ ودیعت کیا گیا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ حق و باطل کے معرکوں اور نور وظلمت کی کشمکش میں ہمیشہ وہ عصائے موسوی، ید بیضا اور عفت وجمال یوسفی کے ذریعے کامیاب ہوئی ہے اور آج بھی آزادی، قومی خودداری اور اسلام کے دفاع واشاعت میں اس نے بے نظیر اور لاثانی کوششیں اور قربانیاں دی ہیں۔

سامراجی دور

مصری تہذیب متعدد ادوار سے گزر کر قدیم دنیا کے تمام سامراجی عناصر کے پنجۂ استبداد کا شکار ہوئی، دور یوسفی تو جمال ورحمت کا پرتو تھا، پھر مسلسل یونانی، فارسی اور رومی دخل اندازوں کا زمانہ بھی گزرا، رنج ومحن اور ابتلاء وآزمائش، ظلم و استبداد اور محرومی ومجبوری کے ایام میں بھی یہ قوم زندہ رہی اور ہر تہذیب کے اچھے اثرات کو قبول کیا۔

مسیحی دور

حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے ساتھ جو روشنی آئی تھی اس کا وافر حصہ بھی مصریوں کو ملا، اسکندریہ کا چرچ توحید کا گہوارہ رہا، رومن امپائر اپنے آپ کو آخر ایام میں حضرت مسیحؑ کا حقیقی وارث سمجھتی تھی، لیکن اس نے حضرت مسیحؑ کی سادگی اور محبت کو چھوڑ کر مظلوم قوموں کے ساتھ جن جیرہ دستیوں کو روا رکھا ان سے مصری قوم بھی دوچار ہوئی۔

آفتاب نور کا طلوع

جب کفر وانکار کی ظلمتوں نے انسانی دنیا کو گھیر لیا، توحید کا چراغ گل ہوگیا، ثنویت، تثلیث اور ان گنت معبودوں کا دور چلا، آسمانی ہدایت سے لوگوں نے منہ موڑ لیا، اجتماعی نابرابری اور ظلم وستم کی بادشاہت ہر چہار سو پھیل گئی، محروموں، مجبوروں، پریشان حالوں کی آہیں اور کراہیں عرش اعظم تک داد رسی کے لیے دراز ہوئیں، دین کے نام پر تعصب اور تفرقہ کا زور ہوا اور ایک مذہب کے ماننے والوں نے اپنے ہی مذہب کے ماننے والے دوسرے فرقوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تو رحمت الٰہی کے جوش کا مظہر محمد مصطفیٰؐ کی شکل میں جزیرۂ عرب کے جبل فاران سے نمودار ہوا، اسلام روشنی کی کرن، جراحتوں کے لیے پنبۂ مرہم، تمام نفسیاتی واجتماعی واخلاقی واقتصادی بیماریوں کا علاج، سکون کا سایہ اور عطر کا پھایہ بن کر جلوہ گر ہوا اور پورے جزیرۂ عرب کو تیئیس ۲۳ برس کی قلیل مدت میں جنت ارضی کا نمونہ بنادیا۔

مصر اسلام کے سایہ میں

مصر رومن مقدس امپائر کا ایک اہم حصہ تھا اس کی دینی، اجتماعی اور اقتصادی حالت بھی دنیا کے دیگر حصوں سے مختلف نہیں تھی بلکہ مذہبی تنافر، تعصب اور اختلاف کی وجہ سے وہ افراتفری اور خونریزی تھی کہ عصر الشہداء کا ایک باب کھل گیا تھا، مصری قوم بھی دنیا کی دوسری قوموں کی طرح کسی نجات دہندہ کی تلاش اور دعا میں مصروف تھی۔

جب اسلام نے اپنی رحمت وحکمت سے بھری ہوئی تعلیمات کے بازو پھیلا کر فارس اور شام کو اپنے سایہ میں لے لیا تو رومن طاقت نے قسطنطنیہ میں پناہ لی اور مصری علاقہ کو اپنی ریشہ دوانیوں اور سرزمین شام کی دوبارہ باریابی کی کوششوں کا مرکز بنانا چاہا، حضرت عمرؓ خلیفہ دوم کی عقابی نگاہوں نے اس خطرہ کو

بھانپ لیا اور اسلام کے مشہور اور عظیم قائد حضرت عمرؓو بن العاص کے ذریعہ اسلام کی روشنی سے مصر منور ہوگیا، عمرو بن العاصؓ کی لیاقت و بصیرت، عدل و انصاف، عفو و کرم اور دانشمندی نے مغلوب قوم کے صرف جسم ہی نہیں دلوں کو جیت لیا، مذہبی رواداری کا وہ زمانہ مصریوں نے دیکھا جو چشم فلک پیر نے کبھی نہیں دیکھا تھا، جبر و اکراہ کا دروازہ بند ہوا اور مذہبی و سیاسی آزادی کا دور شروع ہوا، مصر کے قبطیوں نے سو سال کے اندر اپنی زبان سے دست کشی اختیار کر لی اور عربی زبان عام ہوگئی، لوگ جوق در جوق اسلام کے پیغام امن و محبت کے گرویدہ ہوئے اور جو لوگ مسیحیت کی پناہ میں رہے ان پر کسی قسم کی سختی یا ناانصافی نہیں کی گئی۔ آج تک مصر کے مسلمان اور مسیحی تفرقہ و تعلی کے بغیر خوش اسلوبی سے قومی مفاد اور اجتماعی فوائد کے تمام کاموں میں برابر کے شریک ہیں، یہ موضوع بہت طویل ہے لیکن یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں دیتا۔

عمرو بن العاصؓ نے فسطاط شہر بسایا، خیموں تلے پڑاؤ ڈالا تھا اس لئے اس کا نام فسطاط پڑا، مصر میں سب سے پہلی مسجد تعمیر کی جس کا نام جامع عتیق، جامع عمرؓو بن العاص اور جامع فسطاط پڑا، ہر اسلامی شہر کی طرح یہ مسجد بھی تعلیم و تربیت کا مرکز بنی، پھر مصر سے شمال افریقہ برقہ اور طرابلس تک عمرو بن العاصؓ کے ذریعہ اسلام پہونچا اور عقبہ بن نافع نے قیروان کی بنیاد ڈالی اور بحر ظلمات تک دریائے رحمتِ الٰہی کی موجیں پہونچ گئیں۔

مصر عہد بنی امیہ میں اسلامی سلطنت کا اہم صوبہ تھا، بنی عباس کی طویل خلافت میں بھی مصر بغداد کے ماتحت ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔

جامع ازہر کا قیام مشرق میں بنی امیہ کے خاتمہ کے بعد اندلس میں دوبارہ بنی امیہ

کی خلافت قائم ہوئی، مصر اور شمال افریقہ بنی عباس کے ماتحت رہے، خلافت سے دور اور کمزور ہونے کے بعد مغربی عرب میں متعدد خاندانوں کی حکومت قائم ہوئی جو بنو عباس کے ماتحت تھے، لیکن اپنی قوت و نفوذ کی وجہ سے وہ یک گونہ آزاد تھے، ادارسہ، اغالبہ اور اس قسم کے دوسرے خاندانوں کا اقتدار قائم ہوتا رہا، تاآنکہ مغرب میں فاطمی حکومت قائم ہوئی، دھیرے دھیرے انہوں نے شمال افریقہ کو زیر نگیں کیا اور مصر میں قبضہ کرنے کی کئی کوششیں کیں، بالآخر چوتھے حکمراں معزالدین کے عہد میں قائد جوہر الصقلی نے مصر پر اپنا اقتدار قائم کر لیا، ۹۶۹ء میں اخشیدی حکومت ختم ہوگئی۔

جوہر صقلی نے قاہرہ کی بنیاد ڈالی اور ایک نیا شہر تعمیر ہوا، قاہر کے معنی زبردست و غالب اور فتح یاب کے ہیں، پہلے اس کا نام معز کے والد منصور کے نام پر "المنصوریہ" رکھا گیا، پھر "المدینۃ القاہریۃ المعزیۃ" پھر اختصار کے طور پر "القاہرۃ" زبان زد عوام و خواص ہوگیا، قاہرہ کی تعمیر اندلسی شہروں کے طرز پر کی گئی تھی، ایک عظیم مسجد کی تعمیر ۲۴ جمادی الاول ۳۵۹ھ مطابق ۹۷۰ء بروز شنبہ شروع ہوئی اور ۷ رمضان المبارک ۳۶۱ھ مطابق ۹۷۲ء میں یہ مسجد مکمل ہوئی اور ۷ رمضان کو پہلی بار جمعہ کی نماز ادا کی گئی، شروع میں اس کا نام "جامع القاہرۃ" رکھا گیا، پھر ایک صدی کے بعد اس کا نام "جامع الازہر" ہوا۔ وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے، اندلس میں سرسبزی و شادابی اور باغات کی وجہ سے شاہی محلوں کو قصر الزہرا کہتے تھے، آج بھی اسلامی محلوں کا نام اکثر جگہ الزہرا ہے اسی وجہ سے مسجد کا نام رکھا گیا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سب مسجدوں سے بڑی تھی اس لیے یہ نام پڑا، کوکب زہرہ بھی اس کی وجہ تسمیہ ہو سکتا ہے، کہا جاتا ہے کہ فاطمہ زہراؓ کے نام نامی کی وجہ سے یہ نام رکھا گیا، مدت تک

مسجد کے دونوں نام لیے جاتے رہے پھر الجامع الازہر عام ہوگیا۔

شروع میں یہ مسجد صرف نماز ادا کرنے اور نئے فاطمی حاکموں کے سیاسی اور دینی پروپگنڈہ کے لیے تھی، تقریباً ۳½ سال بعد اس میں قاضی بن نعمان نے درس دیا پھر باقاعدہ تعلیم اس وقت شروع ہوئی جب قاضی علی بن نعمان نے ۳۶۵ھ (۹۷۵ء) میں اس میں درس دیا، اس کے بعد وزیر بن کلس نے درس دیا اور العزیز باللہ سے باقاعدہ تدریس کے لیے پہلا سرکاری فرمان صادر کرایا، ازہر میں الگ الگ ستونوں کے پاس شیعہ مذہب کی تعلیم دی جاتی تھی، اس کی تفصیل آگے آئے گی

فاطمیوں کے آنے سے پہلے مصر میں سُنی حکومت تھی اور اسی کے مذہب فقہ وعقیدہ کا رواج تھا، فاطمیوں نے شیعی فلسفہ وفکر وفقہ کو فروغ دینے میں جامع ازہر سے کام لیا، اسی طرح مذہبی مواقع عیدین نیز شیعہ تقریبات جیسے محرم، ایام میلاد، اہل بیت اور خلیفہ کے یوم پیدائش پر ازہر میں سرکاری جشن منائے جاتے تھے، محرم کی محفلوں میں جب معز الدین تقریر کرتا تھا تو لوگوں کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں وزرا اور قاضی القضاۃ ۱۰ محرم کو ماتمی لباس پہنے ہوئے ازہر میں آتے تھے، قرآن خوانی او مرثیے پڑھے جاتے تھے، شام کو قصر حکومت میں صف ماتم بچھائی جاتی تھی۔

الغرض ازہر کو شیعہ مسلک کے علمی وفکری فروغ کے لیے اور اجتماعی و دینی ضرورتوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، اس پر اس لیے اعتراض نہیں کیا جاسکتا تھا کہ آج بھی مسجدوں، مدرسوں، یونیورسٹیوں سے بار بار اس اعلان کے باوجود کہ سیاسی سرگرمیاں منع ہیں، لیکن ان میں علمی وفکری مخصوص زاویۂ نگاہ سکھانے اور پھیلانے ہی کا کام نہیں ہوتا بلکہ خالص سیاسی کام بھی لیے جاتے ہیں، جس مخصوص عقیدہ، مسلک اور زاویۂ نگاہ کا

انسان حامل ہوتا ہے اس کی اشاعت کی فکر کرتا ہے، لیکن نقصان دہ بات اس وقت ہوتی ہے جب جھوٹ، فریب، بہتان، زبان بندی اور ظلم وستم کے طریقے اپنائے جاتے ہیں، آزادی کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور اپنی رائے اور عقیدہ سے اختلاف کرنے والوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے۔

فاطمیوں نے دار الحکمت کھولا، ایک عظیم الشان مکتبہ بھی اس میں بنایا، کہا جاتا ہے کہ اس میں دو لاکھ کتابیں مذہب، ادب، فلسفہ، ریاضی، منطق اور دوسرے علوم سے متعلق تھیں، اس تعداد میں بھی راقم کو مبالغہ کا پہلو نظر آتا ہے۔

متعدد فاطمی خلفاء نے ازہر کی ترقی وتعمیر میں حصہ لیا، جس کا مختصر اشارہ بھی یہاں ممکن نہیں۔

ایوبی دور زمین گول میز کی طرح اپنی جگہ پر اٹل ہے کرسیاں بدلتی رہتی ہیں، اور بسا اوقات تو کرسیاں تک نہیں بدلتیں، ان پر بیٹھنے والے بدل جاتے ہیں، رہے نام اللہ کا۔

تقریباً دو سو سال کی فاطمی حکومت کا خاتمہ صلاح الدین ایوبی نے ۵۶۷ھ مطابق ۱۱۷۱ء میں کیا، صلاح الدین نے مصر کو اپنے قدیم مسلک اہل سنت کی طرف لوٹانے کی مساعی کیں، نئے عظیم الشان مدرسے قائم کیے، تعلیم کو فروغ دیا، اہم اور اچھے اساتذہ کو تعلیم وتربیت پر مامور کیا، جامع ازہر کی پوزیشن ختم ہوگئی، اس میں تدریس بند ہوگئی، صلاح الدین ایوبی اور اس کے خلفاء کو غالباً فاطمی عقائد ونظریات کی بیخ کنی کے لیے اس سے زیادہ موثر کوئی طریقہ نہیں ملا اور جس طرح فاطمیوں نے حکومت اور پروپگنڈہ کے زور پر سُنی مذہب کے خاتمہ کی تدبیر کی تھی وہی حربہ اور طریقہ

صلاح الدین نے اپنایا۔

کتب خانہ غرق دریا واقعہ یا افترا

کہا جاتا ہے کہ صلاح الدین ایوبی نے وہ عظیم کتب خانہ بھی غرق دریا کر دیا جو فاطمیوں نے جمع کیا تھا، اس الزام کی تصدیق یا تکذیب کی پوزیشن میں راقم اس وقت نہیں ہے، لیکن بہرحال علمی تحقیق کی ضرورت ہے، اگر یہ صرف معاندانہ الزام ہے تو کوئی بات نہیں لیکن اگر واقعی یہ بات صحیح ہے تو صلاح الدین کے بے شمار روشن کارناموں کے درمیان یہ ایک تاریک اور گھناونا کام ہے، کتابوں کو دریا برد اور برباد وہ لوگ کیا کرتے ہیں، یا کتابوں کو پڑھنے سے وہ لوگ دوسروں کو منع کرتے ہیں، جنہیں اپنے افکار و عقائد پر بھروسہ نہیں ہوتا، حجت و دلیل سے اپنی برتری ثابت نہیں کر پاتے، اہل سنت کے عقائد و افکار روز روشن کی طرح واضح ہیں اور دلائل و حجج اور براہین شرعیہ و عقلیہ سے قطعی طور پر پایۂ ثبوت کو پہونچ چکے ہیں۔

جابرانہ کوششوں کی ناکامی

ہلاکو نے کتابوں کو برباد کیا اور آج وہ سارے اہم کتابیں جو حج بیت اللہ کی بدولت ساری دنیا میں پھیل گئی تھیں چھپ رہی ہیں، اسپین کے متعصب پادریوں نے عربی رسم الخط اور اسلامی کتابوں کا پڑھنا اور اپنے پاس رکھنا قابلِ قتل جرم قرار دیا تھا اور آج اسپین عربی و اسلامی دنیا کے قریب آچکا ہے، ویٹیکن نے قدیم زمانہ سے ہزاروں کتابوں کا پڑھنا حرام قرار دیا ہے اور آج بھی ان ممنوعہ کتابوں کی فہرست چھپتی رہتی ہے، لیکن اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ دنیا میں یہ کتابیں سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہیں، ابن حزم کی کتابوں کو ان کے ہم مذہب متعصب علماء نے ان کے سامنے جلا دیا تھا، لیکن آج دنیا کے کونے کونے سے جمع ہو کر

وہ چھپ رہی ہیں، ابن تیمیہ کی کتابوں کو دنیائے وجود سے ناپید کرنے کی جو کوششیں کی گئیں سب بیکار ثابت ہوئیں، آج وہ علم و فضل اور توحید و فقہ کے ثقہ مراجع میں شمار ہوتی ہیں، انہیں آج شیخ الاسلام کہا جاتا ہے۔

علم اور دین کے نام پر غلامی اور تعصب

آج بھی نہ صرف یہ کہ آمرانہ و جابرانہ حکومتیں حریت رائے اور آزادیِ افکار کی دشمن ہیں اور پروپگنڈہ کے ذریعے اپنی آراء کے فروغ اور دوسروں کی مخالفت میں کوشاں ہیں بلکہ دین کے بعض علمبردار اور علم کے بعض دعویدار بھی پروپگنڈہ کے فن میں مہارت بلکہ عیاری کی حد تک آگے بڑھ چکے ہیں، اپنی مخالف رائے رکھنے والوں کے محاسن پر پردہ ڈالنا اور اپنی غلط آراء و افکار کے محاسن کا اظہار ان کا سب سے دلچسپ مشغلہ ہے، ستم بالائے ستم یہ ہے کہ بعض مقدس حضرات کو کوئی نفع بخش کام نظر نہیں آتا بلکہ دوسروں کی کتابوں کو نہ پڑھنے دینے کی تعلیم دینا ہی ان کا سب سے مبارک کام ہے، چھوٹی عمر کے طالب علموں اور بے علم افراد کو تو بدل ناخواستہ یہ مشورہ دیا جا سکتا ہے، لیکن دینی مدارس کے فارغین یا منتہی طلباء کو کتابوں کے پڑھنے سے روکنا انتہائی غلط ہے، کیونکہ ہر ممنوع چیز محبوب و مرغوب ہوتی ہے، دوسری بات یہ کہ ان کی عمر کے قیمتی سال عقیدہ و علم کی تعلیم میں خرچ ہونے کے بعد بھی اگر ان میں فراست، بصیرت اور دینی و عقلی و فکری پختگی پیدا نہ ہو اور کسی کی بھی کتاب پڑھ کر وہ بہک جائیں یا اس کے ہم نوا بن جائیں تو یہ ان کی بے مائگی اور دیوانہ پن کی نشانی بھی ہے اور دوسروں کی حقانیت کا گویا خاموش اعلان بھی۔

ہر زمانہ میں علماء و حکماء و مفکرین اسلام نے باطل فلسفہ، غیر مسلموں کے افکار اور فرقۂ ضالہ کے عقائد و کتابوں کے مطالعہ کیا اور اس کے بعد شریعت و دین اور

عقل وحکمت کے دلائل کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور حق کبھی باطل کے سامنے دلائل و براہین کی روشنی میں سرنگوں نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔

سو سال تک خطبہ جمعہ و نماز بند

عہد ایوبی کے شروع میں ۵۶۷ھ ہی سے جامع ازہر میں خطبۂ جمعہ و نماز موقوف کر دی گئی کیونکہ فاطمی خلیفہ کی دینی و تعلیمی و عقائدی تعلیم کا مرکز تھا اور ایک شرعی حجت یہ بھی تھی کہ نئے قاضی القضاۃ صدر الدین بن درباس شافعی نے یہ فتویٰ دیا کہ ایک شہر میں جمعہ کے دو خطبے ہونے صحیح نہیں ہیں، یہ بات اس کے بعد کے تمام عالم اسلامی کے فتاویٰ میں پائی جاتی ہے، سو سال کے بعد جب سلطان الظاہر بیبرس (۶۵۸ھ) میں آیا تو اس نے دوبارہ جامع ازہر میں خطبہ و نماز جمعہ ربیع الاول ۶۶۵ھ میں جاری کیے۔

جامع ازہر کی ترقی کا دوسرا دور

ایوبی دور کے شروع میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب ازہر مرجھا جائے گا اور اس کی علمی و اجتماعی پوزیشن تاریخ کا قصۂ پارینہ بن جائے گی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے دین صحیح اور علم صحیح کی حفاظت و اشاعت کا پروانہ بخش دیا تھا، ایوبی دور کے آخر میں ازہر اپنے علمی کام میں مصروف ہو گیا تھا، ابن خلدون نے اس جامع میں تدریس کی محل سجائی، موسیٰ بن میمون نے فلسفہ، ریاضیات اور طب وغیرہ کا درس دیا، ان کے علاوہ بھی دوسرے اہم علماء کے کارناموں سے ازہر بام عروج کو پہونچا، حدیث و فقہ کی تعلیم عام ہوئی۔ دور ایوبی کے آخر میں یہ سمجھا گیا کہ اب ازہر سے فاطمی جراثیم ختم ہو چکے ہیں، اس لیے دوبارہ اسے اشاعت علم و دین کا مرکز بنایا جائے اور سیاسی و اجتماعی زندگی کی سربراہی کا منصب عطا ہو۔

جب ظاہر بیبرس نے شافعی قاضی کے بجائے حنفی قاضی بنایا اور جامع ازہر میں جمعہ و خطبہ دونوں جاری ہوا تو امیر بدر الدین بیلبک انخازندار نائب السلطان نے اس پُرمسرت موقع پر فقہ و حدیث کے مدرسین کے لیے اوقاف وقف کیے، جو اوقاف ضبط کیے گئے تھے انہیں واپس کیے جانے کا حکم دیا، ازہر میں تعلیم کی اہمیت کا دور شروع ہوا، بیبرس ممالیک میں سے تھا، ممالیک وہ غلام تھے جو صلاح الدین ایوبی نے اواسط آسیا سے منگائے تھے اور اسلحہ و خیول حربیہ کی ان پر ذمہ داری تھی، ایوبیوں کے مدافع اور معتمد تھے، ان کی عربی زبان معمولی تھی، لیکن ازہر کے علمی و عربی نشاط کی وجہ سے عربی زندہ رہی، اس لیے بیبرس کو ازہر کا مجدد اور اس میں زندگی کی دوبارہ لہر دوڑانے والے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس کے زمانے میں تعمیری ترقی بھی ہوئی، ازہر کی تعمیری و تعلیمی و سیاسی ترقی پر ہم الگ سے مختصر تبصرہ کریں گے۔

سقوط بغداد و اندلس کے بعد مصر کعبۂ اہل علم

ممالیک مصر کے زمانہ میں عالم اسلامی سب سے سخت تاریکی کے دور سے گزر رہا تھا، بغداد تاتاریوں کی بربریت کا شکار تھا اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، مرکز حکومت و خلافت اور خلیفہ و اعیان و عساکر کا وہ قتل عظیم رونما ہوا تھا کہ چشم فلک نے ایسا منظر اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا، مسلمانوں کے مقدس خون سے دریا کا رنگ سرخ ہو گیا تھا اور ان کے علمی کارناموں کے اوراق کی روشنائی سے پانی سیاہ ہو گیا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اسلام اور اس کی تہذیب پردۂ ہستی سے نابود ہو جائے گی۔ لیکن بہرحال اسلام اپنی داخلی قوت سے دوبارہ اسلاف ہلاکو خاں کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ابھرا، لیکن بغداد کو وہ عروج پھر آج تک نصیب نہیں ہوا۔

مشرق عربی و اسلامی کا یہ غم ناک منظر تھا، اُدھر مغرب عربی و اسلامی اندلس میں طوائف الملکی اور آپسی اختلاف و شقاق اور بے شمار سلطنتوں کے قیام اور محاربت کی وجہ سے ایک ایک سلطنت یکے بعد دیگرے مسیحیوں کے قبضے میں جارہی تھی اور حکم اسلامی غرناطہ میں محصور ہوکر دو سال بعد ختم ہونے والا تھا، ہر طرف مسلمانوں کی لاشیں اور خون کے نشانات تھے۔

اس موقع پر مصر اور مصریوں نے سینے کھول دیے، مہاجرین اور علمار و فضلار ہر جگہ سے مایوس ہوکر مصر میں آباد ہوئے، ساتویں صدی ہجری میں جامع ازہر نے اپنی تاریخی ذمہ داری پوری کی اور اسلامی افکار، علوم و میراث کو ضایع ہونے سے بچایا، اس کی حفاظت کی اور اس کو مزید قوت، روشنی اور تازگی عطا کی، مصر میں ابن خلدون، عبداللطیف بغدادی، ابن الفارض، ابن خلکان، حافظ ابن حجر عسقلانی قلقشندی، مقریزی، بدرالدین عینی اور ان جیسے دوسرے اعلام اسلام نے علمی، تصنیفی اور تدریسی خدمات انجام دیں۔

جو نئے مدارس کھلے ان میں بھی ازہری علمار درس دیتے تھے، اسی زمانہ سے منطق، فلسفہ، طب، تصوف کی تعلیم شروع ہوئی، صحاح ستہ، مسند امام احمد و مسند شافعی وغیرہ اہتمام سے پڑھائی گئیں۔ مزید تفصیل ازہر کی تعلیم کے سلسلے میں کی جائے گی۔

الغرض بغداد و اندلس کے بعد مصر، قاہرہ اور ازہر علم و میراث عربی و اسلامی کے شعار بن گئے اور آج تک باتفاق علمار و مورخین اسلام اس کی حفاظت کا سب سے بڑا مرکز ہے اور ساری دنیا میں اس کو نشر کرنے اور لغۃ الضاد (عربی زبان)

کی حفاظت، اسلامی علوم کی بقا اور دفاع کا سب سے مستحکم قلعہ ہے۔

مصر عہد عثمانی میں

مصر میں ترکوں کے داخلہ کے اسباب، ممالیک کے عہد کی بے اصولیاں، عثمانیوں کے دشمن ایران کے صفویوں سے تعلقات وغیرہ کی تفصیل یہاں غیر ضروری بھی ہے اور وہ مختلف فیہ بھی ہے، تاریخ میں ترکوں کے ساتھ محبت اور نفرت کے دونوں جذبات ملتے ہیں، ایک طرف ان کی عظیم بحری اور بری طاقت کی وجہ سے دشمنان اسلام سے جہاد اور ان کی سامراجی سازشوں کے خلاف انتباہ، دفاع اور ہر قسم کی فوجی کارروائی، پرتگالیوں کی سازش سے مکہ کو محفوظ رکھنے، خادم الحرمین الشریفین ہونے اور پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے مرجع کی حیثیت رکھنے اور عظیم اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کی وجہ سے عالم اسلام اور مصر کے باشعور مسلمان ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اسی وجہ سے سامراجی مغربی دشمنوں نے اس جذبہ کی بیخ کنی کرنے، خلافت کی طاقت ختم کرنے اور وسیع اسلامی مملکت کو پارہ پارہ کرکے اس کی جگہ پر بے شمار چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کرنے کی پالیسی بنائی اور کئی سو سال کی لیئمانہ سازشوں، بے شمار جنگوں اور ترکوں اور عربوں میں اس حد تک قومی نظریات کو فروغ دینے کی کوششیں کیں کہ نفرت کے تخم زہر آلود دلوں میں پیوست ہوجائیں اور عین جنگ کی حالت میں بغاوت نمودار ہوجائے، اس تاریخی پس منظر کی تفصیل کے لیے ایک کتاب بھی ناکافی ہے۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ سنت حیات یہ رہی ہے کہ طاقت کا نشہ اور حکومت کا جادو اکثر اوقات جزوی یا کلی ظلم و زیادتی کو جنم دیتا ہے، ہر چند کہ ترکوں نے مصریوں کو ممالیک کے جور و استبداد سے آزاد کیا، لیکن اقتدار مکمل ہونے کے لیے

انہیں بعض زیادتیاں بھی کرنی پڑیں، قتل و ذبح بھی ہوئے، ترکی زبان کی اشاعت تعصب کی حد تک بڑھی اور اسے سرکاری زبان بنایا گیا، گو عربی زبان بھی رائج رہی، علماء، کتابیں اور مخطوطات اور نوادر قسطنطنیہ منتقل کیے گئے، ان کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ آستانہ سے چھپے اور پھر مصر سے بھی ان کی اشاعت ہوئی لیکن مصریوں کے دلوں میں ان کی بے پناہ اسلامی خدمات کے باوجود ان سے غصہ ابھرا اور انہیں بھی سامراجی سمجھا گیا، ان حالات کی تفصیل بھی یہاں ممکن نہیں۔

ازہر عہد عثمانی میں لیکن ازہر کا اہتمام عہد عثمانی میں پہلے سے زیادہ ہوا، ازہر میں عربی زبان تعلیم و تبلیغ کی زبان باقی رہی، عثمانیوں نے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ عربی علوم اور عربی زبان کی بقا میں ازہر کا بہت بڑا حصہ ہے، ازہر کے احترام کا یہ حال تھا کہ فساد اور مذابح کے وقت بھی اگر کوئی ازہر میں پناہ لے لیتا تھا تو حکام اس کو گزند نہیں پہونچاتے تھے، اس لیے ازہر اپنا پیغام عام کرتا رہا۔

شیخ الازہر کا منصب سلطان سلیم کے زمانہ میں شیخ الازہر کا منصب قائم کیا گیا تاکہ ممالیک کے زمانہ کی خرابیوں کو دور کیا جائے اور کیونکہ ازہر کے کام بہت بڑھ گئے تھے اس لیے باقاعدہ اس کا انتظام شیخ الازہر سنبھالے، اس سے پہلے ہر زمانہ میں سلطان مصر ہی براہ راست اس کا انتظام کرتا تھا، کہا جاتا ہے کہ سنہ ۱۶۹۳ء میں پہلے شیخ الازہر ابراہیم بن محمد البرماوی ہوئے تھے، لیکن مصادر و مراجع سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے شیخ الازہر کچھ عرصہ کے بعد شیخ الخرشی ہوئے تھے۔ گو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ پہلا شیخ الازہر کون تھا تاہم اس سے ازہر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے،

اس عہد میں قدیم تقلیدی تعلیم و نظام معیشت ہی جاری رہے، جس کی تفصیل تعلیمی حالت کے ضمن میں کی جائے گی۔ اب ہم اس کو واضح کریں گے کہ جامع ازہر کی دینی و سیاسی حیثیت کیا تھی اور آزادیٔ وطن کے لیے جد و جہد میں اس کا کیا حصہ رہا ہے۔

فاطمی عہد میں ہی ازہر کی دینی حیثیت نمایاں ہوگئی تھی اور وہ فاطمی مذہب کے پروپگنڈے کا مرکز بن گیا تھا، لیکن سیاسی طور پر خلیفۂ فاطمی اور دعاۃ کا قبضہ تھا ازہر تدریسی اور عقائدی امور ہی کا ذمہ دار تھا۔

ایوبی دور کا حال ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ دینی پوزیشن ختم ہوگئی تھی اس کے بعد رفتہ رفتہ ازہر کی تدریسی و دینی پوزیشن بڑھتی گئی اور اس کے نتیجہ میں مصری عوام پر ازہر کا اثر بڑھتا گیا، ممالیک کے سلاطین بھی ازہر کا احترام کرتے تھے اور ان کی رائے کے خلاف کام کرنے سے گھبراتے تھے، علمائے ازہر جرأت و بے باکی سے ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھاتے رہتے تھے۔

ممالیک کے خلاف احتجاج ترکی عہد میں ممالیک کے مظالم بڑھ گئے تھے۔ ازہر کے علماء نے کئی بار احتجاج کیے، ۱۷۸۶ء میں شیخ احمد الدردیر نے حکومت کے خلاف زبردست احتجاج کیا جس میں تمام مصری عوام نے ساتھ دیا، والی ابراہیم بک نے عوامی مطالبوں کو قبول کیا، نائب والی کے ذریعے عوام کو رضامند کرنے کے ساتھ یہ وعدہ کیا کہ امرائے ممالیک کو ظلم و جور سے روکنے کی پوری کارروائی کی جائے گی۔

اسی طرح سنہ ۱۷۹۵ء میں بلبیس کے عوام جب ممالیک کے ظلم کا شکار ہوئے تو شیخ الجامع الازہر عبداللہ شرقاوی کے پاس آئے اور دہائی دی کہ ہمیں ظلم سے بچایا جائے، شیخ شرقاوی، شیخ سادات کے گھر میں علماء سے ملے اور آئندہ کا پروگرام

طے کیا کہ کس طرح محمد بک الالفی اور اس کے کارندوں کو ظلم سے روکا جائے۔ جب والی مصر ابراہیم بک کو اس کا پتہ چلا تو انہوں نے نائب والی ایوب بک الدفتر دار کو علماء سے گفتگو کے لیے بھیجا، علماء نے جرأت و صراحت کے ساتھ یہ مطالبے رکھے "ہم انصاف چاہتے ہیں، ظلم رفع کیا جائے، ان معاملات میں شریعت کے احکام پر عمل کیا جائے، جو نئے ٹیکس ایجاد کیے گئے ہیں اور زبردستی وصول تحصیل ہو رہی ہے اسے ختم کیا جائے"۔ نائب والی نے کہا "ان سب مطالبات کو منظور کیسے کیا جا سکتا ہے، اقتصادی زندگی مفلوج ہو جائے گی"۔ علماء نے اس کا جواب عقل و شرع کے عین مطابق اس طرح دیا "یہ بات نہ اللہ کے نزدیک مقبول ہے اور نہ اس عذر سے عوام راضی ہو سکتے ہیں، اسراف اور اس کثرت سے ممالیک کی خریداری کی کیا ضرورت ہے اور امیر و حاکم عوام کو دینے اور عطا کرنے سے امیر کہلاتا ہے، لوٹنے کھسوٹنے سے نہیں"۔

علماء کے احتجاج سے والی مصر اور امرائے ممالیک ابراہیم بک و مراد بک کے اوسان خطا ہو گئے، اور علماء نے تین نقاط پر مشتمل ایک تجویز پیش کی، ایک یہ کہ کوئی نیا ٹیکس اس وقت تک نہیں لگایا جائے جب تک مشائخ جامع ازہر موافقت نہ کریں کہ وہ عوام کے نمائندے ہیں، دوم یہ کہ عدالتوں کا احترام حکام کریں، سوم یہ کہ کسی بھی شخص کی آزادی اور حقوق پر قانونی حدود کے علاوہ دست درازی نہ کی جائے"۔ والی مصر نے ان مطالبوں کو مانا اور ایک تحریری وثیقہ ابراہیم بک اور مراد بک کے دستخط اور مہر سے لکھا گیا جو "وثیقۂ سیاسیہ" اور "وثیقۂ منزل ابراہیم بک" کے نام سے مشہور ہوا۔

نپولین کا قبضہ اور ازہر کا احتجاج

۱۷۹۸ء میں مصر پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہو گیا، مشہور فرانسیسی جنرل نپولین بونا برت نے اپنی بحری طاقت کے ذریعے یہ قبضہ کیا، نپولین عربی لباس میں ملبوس تھا اور اعلان کیا کہ خلیفۃ المسلمین کی اجازت سے مصریوں کو حکام کے ظلم سے نکالنے کے لیے وہ آیا ہے، نپولین کے حملہ نے مصریوں کی عموماً اور مشرقی دنیا کی آنکھیں کھول دیں اور انہیں فوجی علوم نیز سائنسی اور صنعتی علوم کی ضرورت کا اندازہ ہوا، جس کی تفصیل بعد میں کی جائے گی، نپولین نے پریس کھولا، پہلا سرکاری جریدہ شائع کیا، اکیڈمی بنائی اور ان سب چیزوں کا اثر بعد میں واضح ہوا، فرانسیسی حملہ پر اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ اب یہاں اس کی تفصیل غیر ضروری ہے۔

عام مصریوں نے فرانسیسی قبضہ کو دل سے نہیں مانا اور اس کے خلاف محاذ بنایا لیکن جامعہ ازہر جو عوام کا دینی اور سیاسی ادارہ بھی تھا اور رہبر و رہنما سمجھا جاتا تھا اس نے اس حملہ کے خلاف عملی اقدام کیا جس کی پاداش میں ازہر پر بُرا وقت آیا۔

"نپولین بھی ازہر کی اہمیت سے واقف تھا اس لیے اس نے شیخ الازہر عبداللہ الشرقاوی کو اس سرکاری دیوان عام کا رئیس بنایا جس میں اعیان و علماء شامل تھے اور قاہرہ کے دیوان کا رئیس بھی بنایا، کہا جاتا ہے کہ نپولین نے تکریم کی غرض سے شیخ کے بازو پر تین رنگوں والا فرانسیسی نشان علماء و اعیان و فرانسیسی جنرلوں کے سامنے لگایا، لیکن شیخ نے اسے اکھاڑ کر نپولین کے قدموں میں ڈال دیا، نپولین سخت غصہ میں تھا، شیخ کا یہ عمل اسلامی جرأت اور کردار کے عین مطابق تھا۔

یہاں نپولین کے ازہر پر مظالم کا مختصر نقشہ پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس نے مصریوں پر بھاری ٹیکس لگائے اور عوام پر اس کے جنرلوں اور سپاہیوں نے بہت ظلم کیے، جس کی وجہ سے ۱۷۹۸ء میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی، علمائے ازہر ہی مصری عوام کے دینی و علمی و سیاسی رہنما تھے، تمام فرانسیسی مخالف طاقتیں اور افراد جامع ازہر میں جمع ہوتے تھے، جب حاکم قاہرہ جنرل ڈیپوی (DAPUY) نے ان پر شہ سواروں کے ساتھ حملہ کیا تو انہوں نے جوش و غضب میں جنرل اور اس کے بعض سپاہیوں کو قتل کر دیا۔

ازہر میں اس وقت پندرہ ہزار افراد موجود تھے، فرانسیسی فوج نے قلعہ کی چوٹی پر توپیں نصب کر دیں اور ازہر کو نشانہ بنالیا اور فوجی حصار کھینچ کر عوام کو دھمکایا، توپوں نے ازہر کے اردگرد عوامی مکانات اور ازہر پر گولہ باری کی، اسکے بعد فرانسیسی فوج کے گھوڑے جامع الازہر الشریف کے صحن میں داخل ہو گئے اسکی رواقوں میں گھس گئے، حرمتِ مسجد کی توہین کی، قبلہ رو گھوڑے باندھے، تمام سامان ذخیرے، کتابیں، قلم دواتیں تک لوٹ لیں، مسجد میں شرابیں پییں، چار ہزار کے قریب مصری شہید ہوئے، یہ ابتدائی اصول فرانسیسی مہذب بھول گئے کہ ہر جگہ عبادت گاہ میں داخل ہو جانے والا شخص امن و امان پاتا ہے۔

کبار علمائے ازہر نپولین سے ملے اور امن و امان کا مطالبہ کیا، اس نے زبانی وعدہ کیا تاکہ علمائے ازہر کو گرفتار کر سکے اور جو علماء اس بغاوت کو بھڑکانے والے تھے ان میں سے پانچ کو گرفتار کر لیا، جرأت و شجاعت کی تاریخ کو زندہ رکھنے کی غرض سے ان کے نام درج کیے جاتے ہیں، شیخ سلیمان الجوسقی، شیخ احمد الشرقاوی شیخ عبدالوہاب الشبراوی، شیخ یوسف المصیلحی، شیخ السہیل البرادی، پھر علماء کے

ایک وفد کے مطالبہ پر ان کو چھوڑ دیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ نپولین نے بغاوت فرو ہونے کے بعد میدان قلعہ میں چھ علماء کو قتل بھی کیا تھا۔

انتقامی کارروائی کے طور پر ازہر کے طالب علم سلیمان الحلبی نے اپنے ایمان و یقین کے خنجر آبدار سے جنرل کلیبر (KLEBRE) کو قتل کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد شیخ شرقاوی اور دوسرے علماء کو گرفتار کیا گیا، ان پر مقدمہ چلا، وہ مقدمہ میں عدالت سے بری ہو گئے لیکن فرانسیسیوں نے ازہر اور ازہریوں کا ناطقہ بند کر دیا اور ان پر حالات کا اتنا دباؤ پڑا کہ شیخ الازہر شرقاوی نے جون ۱۸۰۰ء میں ازہر کو غیر معینہ مدت کے لیے بند کرنے کا اعلان کر دیا، شیخ کے اس اقدام سے فرانسیسیوں کی پوزیشن مصری عوام کے سامنے اور خراب ہو گئی۔

فرانسیسیوں کا مصر سے اخراج

نپولین کے داخلہ کے وقت مصر خلافت عثمانی کا ایک صوبہ تھا، اس لیے مناسب وقت اور تیاری کے بعد ترکوں نے فرانسیسیوں کو مصر سے نکالنے کا پروگرام بنایا، مصریوں کی داخلی ناراضگی اور برہمی اور تیاری کے ساتھ ترکوں نے بری حملہ کی تیاری کی اور اسلحے ارسال کیے اور انگریزوں سے معاہدہ کر کے بحری حملہ کرایا اور اس طرح فرانسیسیوں کا مصر سے اخراج ہوا اور مصر دوبارہ ترکی تحویل میں آیا، انگریزی تسلط بھی بعد میں آیا، الغرض جون ۱۸۰۱ء میں دوبارہ ازہر ایک سال کے بعد کھل گیا۔

ختم بخاری یا اسلحہ جنگ کی تیاری

عبرت و نصیحت کا ایک واقعہ یہاں درج درج کرنا ضروری ہے کہ جب مصر کا والی مراد بک نپولین سے دفاع کی کوشش کر رہا تھا،

اس وقت مصری فوج کی حالت ابتر تھی اور ترکیوں کے حکام اعلیٰ نے اس کی طرف توجہ کم کی تھی اور علماء و مشائخ اس بات پر مسرور تھے کہ وطن کی طرف سے دفاع اور فوجی ٹریننگ و جہاد کی مشق مدت سے تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہونے کے بجائے جیسی کہ حضورؐ انور اور خلفائے راشدین اور خلفائے بنی امیہ کے زمانہ میں تھی، صرف تنخواہ دار فوجیوں کے ذمہ رہ گئی ہے بلکہ اس پر مستزاد علماء و مشائخ نے اپنے آپ کو جہاد کی عملی مشق سے بالکل آزاد کرلیا ہے، ذکر و تلاوت اور علم و حکمت وغیرہ کے وہ ذمہ دار ہیں، بہرحال اس حد تک کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ عام حالات میں علماء و مشائخ ان کاموں میں مشغول رہیں اور جس غرض سے اللہ تعالیٰ نے ان کی جانیں اور اموال خرید لیے ہیں اس سے کلیتہً غافل رہیں لیکن جب باطل و حق کا معرکۂ کارزار ہو اور دشمن سرزمینِ اسلام میں داخل یا ساحل اسلام پر لنگر انداز ہوجائے تو علماء و فقہاء و مشائخ سب اس مسئلہ کو جانتے ہیں کہ جہاد تمام مسلمانوں پر فرض ہوجاتا ہے، بیٹا کو باپ کی اور غلام کو آقا کی اجازت کے بغیر اس میں شامل ہونا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ ذکر الٰہی، تلاوتِ قرآن، احکامِ شرع کی پابندی اور خدا کی یاد اور دھیان سے بھی ایک لمحہ غافل نہ ہونا چاہیے اور فتح و نصر اور کامیابی و ظفر بخشنے والے الناصر المستغیث، ولی و کارساز خدا سے دعا بھی اضطراری کیفیت کے ساتھ کرنی چاہیے، اس طرح کہ ہاتھ اس کے سامنے دستِ سوال بن جائے اور دل اس کے روبرو جھک جائیں اور خدا کی مدد ان تکوینی اسباب کو پوری طرح پورا کرنے کے بعد آتی ہے جن کا حکم اللہ نے دیا ہے اور جن کی عملی تربیت اسوۂ رسول پاکؐ اور عمل صالح و عظیم خلفائے اسلام کی زندگیوں میں ہمیں ملتی ہے۔

بدر کے میدان میں جب اپنی پوری طاقت خدا کے روبرو پیش کردی اور جسم و جان کے ساتھ قتال کے لیے تیار ہوگئے اور حاکم و نبی و علماء و صلحاء سب کے سب خود بخود اسلام کے مجاہد اور فوج بن گئے تب نبی پاکؐ نے لجاجت اور عاجزی اور ایقان نصر کے ساتھ مدد کی دعا کی اور "امن یجیب المضطر اذا دعاہ" اتارنے والے مجیب السائلین نے انہیں فتح مندی عطا کی۔

ذکر الٰہی اور دعا کا تقاضا ہے کہ اس کے احکام کو پورا کیا جائے اور جس موقع پر جو ترکیب خدا نے بتائی ہے اس پر مکمل عمل کیا جائے، اللہ کا حکم مسلمانوں کو یہ دیا گیا کہ "جو بھی قوت کے طریقے ہوں ان کی تیاری اور مشق میں لگے رہو اور گھوڑوں کو تیار رکھو تاکہ اس کے ذریعے خدا کے اور اپنے دشمنوں کو ڈراتے رہو" (انفال : ۶۰) گھوڑوں کی تصریح اس لیے کی کہ اس وقت اونٹ اور خچر کے مقابلہ میں گھوڑے سب سے زیادہ طاقتور اور جنگ کے لیے موزوں تھے اور قوت کو عام رکھا کہ ہر زمانہ کے اسباب قوت اس میں شامل ہیں، اسی طرح لوہے کا تذکرہ ہے "تلوار گناہوں کو مٹانے والی ہے"، "جنت تلواروں کی چھاؤں میں ہے"، تیر اندازی سیکھنے کا حکم ہے، یہ سب اس وقت کے ہتھیار اور سامان جنگ و دفاع تھے، نپولین کے وقت اس زمانہ کے ہتھیار اور عصر حاضر میں آج کے ترقی یافتہ ہتھیاروں کی ضرورت ہے اور ان کے ساتھ جب ایمان و یقین کا سب سے بڑا اور طاقتور ہتھیار مل جائے گا تو پھر فتح و ظفر یقینی ہوجائے گی۔

اس کے بالمقابل مصر کے علماء و مشائخ جہاد کی تیاری کے بغیر صرف ذکر و مناجات میں مشغول تھے، طرقِ فقرائے احمدیہ، سعدیہ، دفاعیہ وغیرہ میدانِ جنگ میں جاکر

دعا وجہاد کے کاموں میں شریک ہونے کے بجائے سڑکوں پر، زوایا میں اور جامع ازہر
میں بھی جمع ہو کر ان مشاغل میں مصروف رہتے تھے، ذکر الٰہی اور قرآن کے ساتھ ایک
نیا وطیرہ ختم بخاری شریف کا بھی کرتے تھے جو اس سے پہلے رائج ہو چکا تھا، بخاری شریف
کا پڑھنا اور ختم کرنا علم کے حصول کے لیے، اسوۂ رسولؐ معلوم کرنے کے لیے اور زندگی
کو کتاب و سنت کے نہج پر ڈالنے کے لیے تو اساتذہ و طالب علموں کے لیے ضروری ہے
اور کتاب اللہ کے ساتھ مل کر تشریع اسلامی کا عظیم ماخذ بھی ہے۔

تلاوتِ قرآن شریف تو بہر حال بے سمجھے ہوئے بھی کار ثواب ہے کہ وہ تلاوت
کے لیے نازل ہوا ہے اور اس کو بھی سمجھ اور غور کے ساتھ پڑھنا ہی ضروری اور زیادہ
افضل ہے، قرآن تعبدی ہے اس کی سب سے چھوٹی سورت یا بڑی آیت سے نماز
ادا ہوتی ہے، بخاری و مسلم و صحاح ستہ ایک رکعت میں پڑھ لی جائے تو اس سے
نماز ادا نہ ہوگی، پھر اگر کسی چیز کا ختم کرنا ہی ضروری ہے تو وہ قرآن پاک ہونا چاہیے
زندگی کی پریشانیوں سے چھٹکارے اور دشمنانِ اسلام پر فتح کے لیے بخاری کی تلاوت
اور صرف موت کے وقت کے لیے ختم قرآن کا رواج آخر کس بنیاد پر ہے؟ قرآن
کتاب حیات ہے پھر بھی جنگ کے وقت اسباب جنگ پر عمل اور تیاری ہی قرآن کا
حکم اور شریعت کی مرضی اور عقل و دانش کا تقاضا ہے، یہ بات متفق علیہ ہے کہ قرآن
زندگی کا قانون ہے اور اس کے نزول کا اصلی مقصد اس پر عمل کرنا ہے، اس لیے
زندگی کے کسی بھی موقع پر عمل کے بجائے صرف تلاوت قرآن کافی نہیں ہے،
تلاوت کے ساتھ حسب موقع تعلیماتِ قرآنی اور احکام پر عمل ہو تو مفید ہے۔

اسوۂ رسول پاکؐ و صحابہ یہ تھا کہ روزانہ قرآن کی تلاوت کرتے تھے اور

امن و جنگ میں ذکر الٰہی سے غافل نہیں ہوتے تھے اور خدا کے بنائے ہوئے اسباب
و احکام پر پوری طرح عمل کرتے تھے، غزواتِ نبیؐ اور بے شمار خلفائے اسلام کی جنگوں
میں جو عمل ہوا تھا اسی کا کرنا مسنون بھی ہے اور جلبِ رحمت و مدد کا سبب بھی۔

بخاری شریف اور دوسری احادیث پاک میں وارد دعائیں تو جنگ کے وقت
بھی قرآنی دعاؤں کے ساتھ مانگنا ضروری اور صحیح ہے، لیکن وقف و حدود، نکاح و
طلاق اور جملہ ابواب کو بلا سوچے سمجھے تلاوت کے انداز میں پڑھنے کے کیا فوائد
ہیں؟ اور کیا یہ اسوۂ رسول پاکؐ سے ثابت ہے، شوق جہاد و شہادت سے
میدانِ جنگ اور شہریوں کے دلوں میں شجاعت اور جنت کی تمنا پیدا کرنے والی
آیتیں اور حدیثیں تو بہر حال موزوں ہیں۔

سقوط بغداد کے موقع پر

سقوط بغداد سے پہلے بھی ہماری ناکامیوں
کی طویل داستان کے پیچھے جو کہانی چھپی ہوئی ہے وہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو
قوانین فتح و نصرت، جو اسباب و وسائل جنگ اور جس حکمت عقلی و بصیرت سیاسی
کا حکم دیا تھا، اس میں اس درجہ کمی آگئی تھی کہ بیان سے باہر ہے، اتحاد کے بجائے
ہر جگہ اختلاف انشقاق، طوائف الملوکی کا زور، پایۂ تخت کی ماتحتی صرف نام کی حد تک
باقی تھی، باقی ہر جگہ ایک خلافت و حکومت قائم تھی جو باہم ایک دوسرے سے
نبرد آزما تھیں، علماء میں فلسفہ و الٰہیات کی بحثیں تھیں، احناف و شوافع کے
جھگڑے تھے، آمین بالجہر اور بالسر اور فاتحہ خلف الامام کی بحث ہی دین کی سب
سے بڑی ضرورت اور خدمت سمجھی جا رہی تھی، اپنے مخالف رائے رکھنے والوں پر کم
سے کم فسق و ضلال کے فتوے تھے۔

فوجی قوت میں جو کمی آگئی تھی اس کی کوئی فکر نہ تھی، خارجی دشمنوں سے زیادہ داخلی دشمن، آستین کے سانپ، خلافت کو کمزور کرنے کی پالیسیوں اور سازشوں میں مصروف تھے، ان کی پردہ دری کرنے والا کوئی نہیں تھا، خلیفہ کا اپنا وزیر اعظم خلافت کے خاتمہ کی اسکیم خارجی دشمنوں سے مل کر بنا رہا تھا، بہت پہلے بار بار کی کوششوں اور اقتصادی زبوں حالی کے بہانے اور خلافت کی طاقت کے جھوٹے اندازے بتا بتا کر وزیر اعظم خلیفہ سے فوج میں تخفیف کا پروانہ حاصل کر چکا تھا، یقیناً فوجی تیاری اور اسلحہ اور ٹریننگ کا حال بھی ابتر تھا، کسی قوم، حکومت اور سیاسی حد بندی کی حفاظت اور دفاع میں اللہ کی تائید کے بعد اللہ نے جس چیز کو سب سے بڑا سبب بنایا ہے اور اس کا حکم دیا ہے، وہ فوج کی تیاری، اسلحہ کی خریداری، ٹریننگ اور روحانی و جسمانی تربیت ہے۔

پھر ہلاکو اور اس کا لشکر بغداد میں داخل ہونے کے نام سے لرزہ براندام تھا، بغداد کی عظمت و قوت کا یہ عالم تھا کہ بڑے سے بڑا بہادر اور جرأت مند دشمن اس میں داخلہ کی حماقت نہیں کر سکتا تھا، پھر دفاعی اعتبار سے اگر فوج شہر میں گھس بھی جاتی تو پتھر، آگ، پانی، لاٹھیوں اور تلواروں سے پورا شہر مدافعت کی خدمت انجام دے سکتا تھا، لیکن وزیر اعظم نے خلیفہ اور اعیانِ فوج کو ایک پُرفریب سازش اور امان نامہ کے ذریعہ صلح کی گفتگو کے لیے شہر سے باہر جمع کرا دیا جہاں خلیفہ، شہزادے، وزراء، علماء، اعیان مملکت سب بھیڑ بکری کی طرح ذبح کر دیے گئے، اور جو قیامت اہلِ اسلام اور بغداد پر آئی وہ تاریخ کے پردہ پر اور زمانہ کے حافظہ پر ثبت ہے۔

اس موقع پر بھی مشائخ زوایا، فقراء، علماء مذاہب کمزوری کے اسباب کو دور کرنے، جوش جہاد میں اضافہ کرنے اور میدان کارزار قائم کرنے، صلح سے باز رکھنے، شہر سے باہر جانے سے خلیفہ کو روکنے اور اعلان جہاد کے ذریعے نئی روح پھونکنے، تلواروں پر دھار کرنے، اسلحہ کی فیکٹریاں قائم کرنے اور خود جہاد کے راستے کو اختیار کرنے کے بجائے ان کا مقدس مشغلہ زوایا اور سڑکوں میں دعا و مناجات اور ختم بخاری شریف تھا جو انہیں حکم الٰہی سے غفلت اور کتاب اللہ وسنت رسول اللہ ﷺ کے احکام اور طریقوں سے روگردانی اور اسباب فتح و ظفر سے بیگانگی کی وجہ سے قہر تاتاری سے نہیں بچا سکا۔

افترا و بہتان سے اجتناب جب کوئی بات لکھی یا کہی جائے تو دین و ایمان اور عقل و دانش کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر غور کیا جائے اگر وہ صحیح ہے تو مانا جائے اور اگر وہ کلی یا جزوی طور پر غلط ہے تو مجادلہ اسلامیہ کے اصولوں پر دلائل کتاب و سنت و براہین عقلیہ (یعنی شرع و عقل) سے اس کا رد کیا جائے اور اس کی غلطی واضح کی جائے تاکہ کہنے یا لکھنے والے کی اصلاح ہو اور بحث و نظر کے بعد راہ واضح ہو جائے، لیکن عام طور پر آج یہ شرعی و منطقی طریقہ استعمال نہیں کیا جاتا، اگر کوئی شخص شرک کے مفاسد کی بات کرتا ہے تو اس پر یہ الزام عائد کر دیا جاتا ہے کہ بزرگوں کی توہین کر رہا ہے، اسی طرح ممکن ہے کوئی صاحب راقم کے ختم بخاری شریف والے سابق تبصرہ پر یہ حکم لگا دیں کہ یہ صاحب دعا کے قائل نہیں ہیں اس کی اثر اندازی کے منکر ہیں، بخاری شریف کو نہیں مانتے وغیرہ تو یہ زیادتی اور کج بحثی ہوگی۔

ہم دعا اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ نے اس کا حکم دیا ہے اور خالق و مالک وقادر کے سوا ہم کس سے فتح مندی کی دعا کریں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح مندی تک پہونچنے کے لیے جن اسباب و وسائل کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے انہیں بھی پورا کرنا ضروری ہے، خدا کے واضح احکام سے روگردانی کے ساتھ دعا کرنا دعا کے ساتھ مذاق کرنا ہے، کوئی شخص بچہ کی خواہش بھی رکھتا ہو اور دعا بھی کرتا ہو اور جب اس سے کہا جائے کہ خدا کا حکم ہے کہ شادی کرو انشاء اللہ بچہ ہوگا تو وہ شادی سے انکار کر دے اور کہے کہ خدا اپنی قدرت و طاقت سے بچہ دے دیگا تو اس کا یہ طریقہ شرع اسلامی کی رو سے غلط ہے، حالانکہ آدمؑ بغیر باپ کے اور عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے پیدا بھی ہو چکے ہیں، اسی طرح ہم جنگ میں جیتنا چاہتے ہیں، دشمن پر فتح پانا چاہتے ہیں تو اللہ سے لو لگاؤ اور اس موقع پر خدا نے جو احکام دیے ہیں ان کو پورا کرو کامیابی ملے گی۔

راقم صحیح حدیث اور ثابت سنت پاک و اسوہ رسولؐ کو قرآن ہی کی طرح شریعت کا دوسرا ماخذ مانتا ہے، وحی غیر متلو مانتا ہے، مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى پر یقین کامل ہے، اس سے زندگی کے اندھیروں میں روشنی کی تلاش کی جانی ضروری ہے وہ قرآن کی تبیین و توضیح ہے تفسیر ہے، اس کی تدریس و تعلیم ضروری ہے، صرف بخاری ہی نہیں مسلم و موطا اور تمام کتب حدیث کو پڑھنا، ان کی اسناد کو جاننا، مباحث صحت و ضعف کو پہچاننا، موضوعات اور واہیات کی نشاندہی کرنا سب ضروری ہے، لیکن کتاب و سنت سے راقم کو اس کا پتہ نہ چل سکا کہ دفع کربات و مشاکل و جلب منفعت و فتح مندی کے لیے بلا سوچے سمجھے اس کی تلاوت کرنا اور اسے ختم کرتے رہنا کس طرح مفید ہے؟

ملا عبدالقادر کی نودریافت تالیف

(کشف الغطا فی احوال اصحاب الصفا)

از
ڈاکٹر شمس بدایونی۔ بریلی

ملا عبدالقادر بدایونی (۱۵۴۰ - ۱۵۹۶ء) کو اکبری دور (۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) کے حق شناس و حق گو مورخ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ فارسی کی قدیم تاریخوں میں ان کو 'ملائے بداؤنی' اور ان کی تاریخ کو 'تاریخ بداؤنی' لکھا گیا ہے۔ لیکن اہل بدایوں انہیں طبقہ علما و مشائخ میں شمار کرتے ہیں۔ اولیائے بدایوں کے جو تذکرے لکھے گئے مثلاً طبقات الاولیاء (سال تصنیف ۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء) روضۂ صفا (۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۸ء) باقیات الصالحات (۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۷ء) تاریخ اولیائے بداؤں (۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء) تذکرۃ الواصلین (مطبوعہ ۱۹۰۱ء) مردان خدا (مطبوعہ ۱۹۶۶ء) وغیرہم میں ان کا ترجمہ موجود ہے۔

بیسویں صدی سے پہلے اس امر کا انکشاف نہیں ہو سکا کہ خود ملا بھی بدایوں میں محو استراحت اولیا و صوفیا کے احوال میں ایک تذکرۃ الاولیاء باسم "کشف الغطاء فی احوال اصحاب الصفا" تصنیف کر چکے ہیں۔ اس صدی کے اوائل میں بدایوں میں آباد شیوخ صدیقی کی شاخ "حمیدی خاندان" کے بزرگ شیخ حمیدالدین مخلص گنوری سبزواری (ف ۷۱۱ھ / ۱۳۱۲ء) کے احوال میں لکھی گئی کتاب سیرۃ الحمید فی احوال السعید۔

مصنف قاضی فدا حسنین (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں۔ ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۵ء) میں پہلی
دفعہ اس تذکرہ کا حوالہ ملتا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں نظامی بدایونی (ف ۱۹۴۷ء) کا دیوان
تجلیات سخن (بدایوں ۱۹۳۰ء) شایع ہوا۔ اس کا مقدمہ مولوی قمر الحسن قمر بدایونی
(ف ۱۹۴۱ء) نے تحریر کیا۔ مقدمہ کے آخری حصہ کو بطور ضمیمہ پیش کرتے ہوئے اسے
عنوان دیا گیا "حالات ملا عبد القادر مورخ بدایوں مع سلام رخصتی"۔ اس ضمیمہ میں
کشف الغطار کے حوالے سے انھوں نے دو جگہ فارسی اقتباسات درج کیے ہیں۔
(ص: ۵۹-۶۰) انھوں نے یہ اقتباس کہاں سے اخذ کیے اس کا حوالہ نہیں دیا گیا
ہے کہ ان کے سامنے تذکرہ زیر بحث کے ترجمہ کی اصل یا نقل رہی ہوگی۔

عصر حاضر کے تذکرہ نویس اور مورخ ضیار علی خاں اشرفی (پیدائش ۱۹۱۳ء)
اس کے ایک نسخہ کی بدایوں میں موجودگی کے چشم دید شاہد ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"کشف الغطار فی احوال اصحاب الصفار مشہور و معروف مورخ حضرت ملا
عبد القادر بدایونی کی تصنیف ہے۔ حضرت مذاق میاں کے یہاں تھی۔ مولوی
ابرار علی صدیقی بدایونی مقیم کراچی سے اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ حضرت مذاق میاں
صاحب ابن البنیرہ ہیں۔ اب سے چالیس سال قبل چھوٹے خاں جمع دار کلکٹری
بدایوں نے لاکر مجھے دکھائی تھی۔" (مردان خدا (برلی ۱۹۹۰ء) ص: ۳۷)

لیکن بدایوں کے بعض مورخین اس تذکرے کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔
مولوی محمد سلیمان (ف ۱۹۶۳ء) (جنھوں نے بدایوں سے متعلق کئی یادگار تحقیقی و
تاریخی مقالے لکھے) لکھتے ہیں:

"قاضی فدا حسنین ..... کے نام سے سیرۃ الحمید فی احوال السعید ..... شایع کی۔

اس کتاب میں ایک حوالہ کشف الغطار نامی کتاب کا دیا ہے اور اس کو ملا عبد القادرؒ
صاحب منتخب التواریخ کی تصنیف بتایا ہے۔ ہم نہایت وثوق سے کہتے ہیں کہ ملا صاحب
کی تصنیف اس نام کی نہیں ہے۔" (ذوالقرنین بدایوں نمبر ۱۹۵۶ء، ص: ۱۲)

ان ہی کے معاصر ایک دوسرے تاریخ نویس مولوی تسلیم احمد خاں (ف ۱۹۸۳ء)
اپنی غیر مطبوعہ تاریخ بدایوں (بسلسلہ آثار) میں گزارش عنوان کے تحت تمہید میں لکھتے ہیں:

"مقامی مورخین میں ملا عبد القادر بدایونی کی مصنفہ ایک کتاب کشف الغطار نامی
کا ذکر داروغہ حامد حسین (فدا حسنین) ولد مولوی عبادت اللہ وکیل ساکن قاضی ٹولہ
نے سیرۃ الحمید میں کیا ہے۔ مگر اس کا تذکرہ خود ملا عبد القادر نے اپنی کسی تصنیف
میں نہیں کیا ہے اور نہ کسی دوسرے تذکرہ نویس نے اس کو لکھا ہے۔ یہ تاریخ
بدایوں بتلائی جاتی ہے۔ مگر اس کی صحت مشتبہ ضرور ہے۔ غیر مطبوعہ بتلائی جاتی ہے۔"

(صفحہ نمبر ندارد مملوکہ راقم الحروف)

ہر معلوم چیز ضروری نہیں کہ موجود ہو اور جو موجود ہے ضروری نہیں کہ معلوم
ہو۔ اس کتاب کے نام اور موضوع کے متعلق جو اشارے دستیاب ہیں اور جن کتب
میں اس کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے ان کے مصنفین کا تعلق (باستثنار
صاحب مردان خدا) خاندان بنو حمید سے ہے۔ گویا حمیدی خاندان ہی میں ملا کی اس
کتاب کا نسخہ یا نقول محفوظ رہیں۔ صاحب مردان خدا نے جن بزرگوں کے یہاں اس
تذکرہ کا نسخہ دیکھا تھا ان کا تعلق بھی خاندان بنو حمید ہی سے ہے۔

بدایوں میں شیوخ صدیقی پانچ خاندانوں میں منقسم ہیں، عثمانی، فرشوری، حمیدی،
شیوخ محمدی یعنی متولی، دانشمندی۔ ان میں سے ہر ایک خاندان کے شجرے اور

تاریخیں مرتب ہو کر شایع ہو چکی ہیں۔[۳]

حمیدی خاندان کے بزرگ شیخ حمید الدین مخلص گنوری سبزواری (۵۸۵ھ/ ۱۱۸۹ء - ۷۱۱ھ/ ۱۳۱۲ء) جو حضرت محمد بن ابوبکر صدیق کی اولاد میں ہیں، خاندانی روایت کے مطابق غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت (۶۶۴/۱۲۶۲ - ۶۸۶/۱۲۸۷ء) میں وارد بدایوں ہوئے۔ ان ہی بزرگ کی نسبت سے یہ خاندان حمیدی کہلایا، انکے بیٹے شیخ صدر الدین (ف ۷۴۰ھ) بدایوں کے قاضی ہوئے۔ شیخ حمید المشہور بہ دادا حمید شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے برادر عم زاد تھے اور حضرت امیر خسرو کے استاد (سرورق تاریخ بنی حمید۔ دیگر ص۹) فارسی تاریخوں یا سعدی و امیر خسرو سے متعلق کتب میں اس کا مذکور نہیں، لہٰذا یہ انکشاف توجہ طلب ہے۔

حمیدی خاندان سے متعلق حسب ذیل کتب تصنیف کی گئیں:

۱۔ الواح حمیدی مصنف نامعلوم سال تصنیف نامعلوم

۲۔ کتاب الانساب الشرفائے بدایوں۔ نواب ظہور اللہ خاں نوا (ف ۱۸۳۰ء)، (اس کتاب کا تکملہ 'اعتصام الاعقاب' کے نام سے مفتی محمد شرف علی حمیدی نے کیا)

۳۔ سیرۃ الحمید فی احوال السعید۔ قاضی فدا حسین (۱۹۴۵ء) مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۵ء۔

۴۔ تاریخ بنی حمید مولوی انشاء اللہ مطبوعہ امیر الاقبال پریس بدایوں ۱۳۳۵/ ۱۹۱۶

ملا سے منسوب محولہ تذکرہ کی صحت کو دو باتیں مشتبہ بناتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ صرف حمیدی خاندان کے اکابر کے احوال ہی میں ماخذ کے طور پر استعمال ہوا۔ بدایوں کے دوسرے اہل قلم اس کے وجود سے بے خبر رہے۔ دوسرے یہ کہ حمیدی خاندان کے بزرگ دادا حمید کو

بغیر کسی تاریخی شہادت کے شیخ سعدی (۶۹۱/۱۲۹۲) کا عم زاد اور امیر خسرو (ف ۷۲۵ھ، ۱۳۲۵) کا استاد قرار دیا گیا۔ لیکن اس کی صحت یا عدم صحت پر بحث کرنے کے لیے اصل نسخے کا موجود ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا اس بحث کو مستقبل کے لیے چھوڑ دینا ہی مناسب ہوگا۔

حسن اتفاق سے حمیدی خاندان کے اکابر کے احوال میں لکھی ایک قلمی کتاب 'تاریخ بنی حمید' مجھے دستیاب ہوئی ہے۔ اس کتاب میں بھی ملا کے اس تذکرے کو ماخذ کے طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے اور جگہ جگہ اس کے حوالے سے معلومات درج کیے گئے ہیں۔ اس تذکرہ کے تعارف کے لیے اس میں خاصا مواد یکجا ہو گیا ہے۔ ذیل میں "تاریخ بنی حمید" کے حوالے سے 'کشف الغطاء' کا دستیاب تعارف پیش کیا جا رہا ہے اردو و فارسی کے وہ محققین جو قدیم کتب کی تلاش اور ان کی مشکوک نسبتوں نیز ان کا جعل ثابت کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں۔ شاید یہ تعارفی تحریر ان کی توجہ حاصل کر سکے اور ملا کی یہ کتاب بھی ان کی تلاش و تحقیق کا عنوان بن سکے۔

تاریخ بنی حمید حمیدی خاندان کے اکابر کی تذکرہ نما تاریخ ہے جو بزبان فارسی بہ قید تاریخ و سنہ تصنیف کی گئی۔ اس کے مصنف مفتی شاہ محمد شرف علی، شرق حمیدی (ف ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۲ء) ہیں، اس کا سال ترتیب ۱۳۰۷ھ اور سال تکمیل ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء ہے۔ اس تاریخ کے مصحح و محشی اور کاتب مصنف کے فرزند حکیم مفتی محمد یٰسین شوق (ف ۱۹۳۸ء) ہیں۔ خاتمہ کتاب میں مصحح نے مصنف کے حالات قلم بند کیے ہیں، جس سے مستفاد ہوا کہ تصحیح و حواشی اور کتابت کا عمل مصنف کی وفات کے بعد کا ہے۔ کتاب کے سرورق کو مطبوعہ کتابوں کے سرورق کی طرح تیار کیا گیا ہے۔ نیچے لکھا ہے "در مطبع

نولکشور واقع لکھنؤ طبع شد"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ کا یہ نسخہ بہ غرض اشاعت تیار کیا گیا تھا لیکن کسی وجہ سے نولکشور پریس کے ساتھ معاملت طے نہیں ہوئی اور یہ شایع نہیں ہوسکا۔ ۱۹۱۱ء کی مطبوعہ نولکشور کی فہرست میں اس کا اندراج نہیں۔ تاریخ بنی حمید کے مطبوعہ ہونے کی فی الوقت کوئی خارجی شہادت موجود نہیں ہے۔

تاریخ بنی حمید کے صفحات کا مسطر کہیں تیس (۳۰) کہیں اکتیس (۳۱) سطری ہے۔ سائز ۱۳×۸ انچ اور صفحات کل ستاون (۵۷) ہیں۔ مصنف کے فرزند محمد لیسین شوق کا مکتوبہ نسخہ حامد میموریل لائبریری بدایوں میں محفوظ ہے۔ راقم الحروف کے پاس اس کی فوٹو کاپی موجود ہے۔

تاریخ بنی حمید میں ملا کی کتاب کا مکمل نام "کشف الغطا فی احوال اصحاب الصفار" درج ہے۔ غطار کے لفظی معنی پردہ سرپوش یا پوشش ہیں۔ یعنی پوشیدہ چیز کا کشف اصحاب صفا کے احوال ہیں۔ غطار لفظ کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس نام میں تاریخ بھی پوشیدہ ہے۔ لیکن کشف الغطار کے عدد (۱۴۴۱) برآمد ہوتے ہیں۔ نام میں تخرجہ یا تعمیہ کے لیے کوئی اشارہ نہیں۔ ملا تاریخ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان سے بعید تھا کہ وہ اس نام میں کوئی نکتہ یا حسن نہ رکھتے۔ چنانچہ غور و توجہ کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ فی احوال اصحاب الصفار کے عدد (۴۴۰) کو کشف الغطار کے عدد ۱۴۴۱ سے اگر منہا کیا جائے تو ۱۰۰۱ عدد برآمد ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ۱۰۰۱ھ کو اس کتاب کا سال تصنیف قرار دیا جاسکتا ہے۔

ملا نے منتخب التواریخ ۹۹۹ھ تا ۱۰۰۴ھ تصنیف کی۔ گمان ہے کہ منتخب کے تیسرے حصے (جس میں عہد اکبری کے علماء و شعراء وغیرہ کے تذکرے ہیں) کی تصنیف

کے وقت بدایوں کے اہل صفا کے حالات محفوظ کرنے کی طرف ان کی توجہ منعطف ہوئی ہو۔

تاریخ بنی حمید سے یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ کشف الغطار بزبان عربی قلم بند کی گئی اور یہ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد چہارم کا حوالہ تاریخ بنی حمید میں آیا ہے۔ (ص: ۹) اصل کتاب غیر مطبوعہ رہی۔

حمیدی خاندان کے ایک بزرگ ملا قطب الدین چشتی نے اس پر حاشیہ لکھا۔ تاریخ بنی حمید کے مصحح نے انتخاب از کشکول شرقیہ کے حوالے سے حاشیہ میں اس کی صراحت کی ہے:

"قطب الدین مرید حضرت مولانا شاہ حسن علی چشتی بدایونی صاحب ولادیت سیونی چھپارن بلک متوسط خلیفہ حضرت مولانا فخر الدین چشتی دہلوی قدس اللہ اسرارہما بود و حاشیہ بسیط بر کشف الغطار از یادگار ایست۔ انتخاب از کشکول شرقیہ ۱۲"

مصحح نے اخبار پانیر کے حوالے سے ایک دوسرے حاشیے میں یہ اطلاع بھی دی ہے کہ کشف الغطار کا فارسی و انگریزی ترجمہ طبع ہو چکا ہے۔ نیز فارسی و انگریزی تراجم کے ساتھ کتاب کا اصل متن (بزبان عربی) بھی ٹائپ پریس لندن سے ۱۸۷۹ء میں شایع ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:

"قولہ کشف الغطا ای عربی مولفہ ملا عبدالقادر فاروقی بدایونی متخلص بہ قادری مورخ بدایوں۔ ایں کتاب را متاخرین بہ تاریخ بدایوں تعبیر می کنند، الحق عمدہ و پر معنی کتاب است کہ ترجمہ او بزبان فارسی مسٹر جان پلیس صاحب انسپکٹر مدارس ممالک متوسط در ۱۸۷۱ء ہزار و ہشت صد و ہفتاد و یک عیسوی نمود و بزبان انگلش ترجمہ

مسٹر ایسٹوک صاحب و ۱۸۵۲ء ہزار وہشت صد و پنجاہ و دو عیسوی کرد و از مقام ہرٹ فورڈ شایع گردید۔ الحاصل اصل کتاب مع ہر دو تراجم فارسی و انگریزی در سہ کالم کتاب مطبوعہ ۱۸۶۹ء ہزار وہشت صد و ہفتاد و نہ عیسوی ٹائپ پریس لندن و کلاسگو دستیاب می شود قیمت جملہ پنج مجلدات وی بست و پنج روبیہ نقرئی سکہ رائج الوقت است۔ از بانیر"

راقم الحروف کو ان ترجموں کے طبع ہونے کا حوالہ کسی دوسری جگہ نہیں ملا۔ مصحح نے یہ اطلاع بقید سنین دی ہے، مطابع کے نام بھی درج کیے ہیں، ایسی صورت میں یہ اطلاع درست معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ان امور کے وجود اردو فارسی کے اہل قلم کی اصل کتاب سے بے خبری باعث حیرت ہے۔

تاریخ نبی حمید میں فارسی و اردو کی تقریباً ۳۲ کتب کا حوالہ ملتا ہے۔ ان میں اکثر فارسی کی معروف تاریخیں اور تذکرے ہیں مثلاً "تذکرۃ الفضلا / خافی خاں، تذکرۃ الصلحا / عین الدین بیجاپوری، مفتاح الخزائن / سکاکی، تاریخ فیروز شاہی برنی، شریف الشرفا / غلام لیسین خاں، مجالس الابرار / قدرۃ اللہ قاسم وغیرہ۔ کشف الغطاء کا جہاں کہیں حوالہ ملتا ہے اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ مصنف اور مصحح دونوں کے پیش نظر اصل نسخہ بزبان عربی نہیں رہا۔ بلکہ فارسی ترجمہ یا اس کی نقل ہی ان کے سامنے رہی۔

تاریخ نبی حمید میں کشف الغطاء کا حوالہ سات جگہ ملتا ہے (ص: ۹، ۱۱، ۱۴، ۱۵، ۱۸، ۲۹، ۳۰) صفحہ ۹ تا ۱۸ پانچ جگہ کشف الغطاء کے حوالے سے معلومات درج ہوتے ہیں جو بالترتیب یہ ہیں:

"وفات آن جامع کمالات بقول صاحب کشف الغطاء بتاریخ ہفدہم ماہ رمضان المبارک

کہ مناسبت بیوم پیدایش دارد سال ہفت صد و یازدہ ۷۱۱ھ و یازدہ ہجرت و یکصد و بیست و شش سال عمر یافت"۔ (ترجمہ حمید الدین مخلص ص: ۹)

"ملا عبد القادر مورخ بدایونی در کشف الغطاء فی احوال اصحاب الصفاء عربی جلد چہارم بذیل صلحاء طبقہ خامہ می نویسد کہ قاضی صدر الدین وقت باقی گنوری بدایونی ابن مولانا حمید الدین مخلص گنوری بدایونی از فحول علماء و مشائخ بدایون ست کہ بعہد سلطنت سلطان غیاث الدین بلبن قاضی بداون شدہ وی جامع بود میان علوم ظاہری و باطنی و شرافت و فتوت و حضرت شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی عم محترم وی ست از یں جہت اولادش نیز شیخ سعدی را عم می خوانند"۔ (ترجمہ قاضی صدر الدین وقت باقی ص: ۹)

"در کشف الغطاء ست کہ ملا نور بدخشانی وقائع نگار سید علاء الدین بادشاہ ہند مقیم بدایوں در محاربات ہند بذیل علمائے سلطان فیروز شاہ تغلق تذکرہ قاضی فتح اللہ بدایونی قاضی آنولہ بایں طور می کند کہ موی الیہ سطوتی ظاہر عظمتے باہر داشت مکالمہ او اہل ذکا را عاجز گردانید باین ہمہ در بذل و عطا مشہور نزدیک و دور و بود"۔ (ترجمہ ایضاً ص: ۱۱)

"ملا عبد القادر بدایونی در کشف الغطاء می نویسد کہ قاضی عبد اللہ المخاطب بہ صدر جہاں بدایونی امیر عدل دہلی و در علم فرائض بسے آوازہ داشت۔ حتی کہ برائے تصفیہ مسئلہ وراثت در مجلس علماء بہ ماوراء النہر طلبیدہ شد و تا دو سال در انجا نہ ہائے علماء مدعو ماند تا آنکہ امیر تیمور صاحب قرآن بہ ہند ایلغار نمودہ آشوب و فتنہ دہلی فرو نشاندہ بانفائس ہندوستان عازم مراجعت گشت"۔ (ترجمہ قاضی عبد اللہ المخاطب بہ قاضی صدر جہاں ص ۱۴)

"در تذکرہ ملا عبد القادر بدایونی ست کہ قاضی عبد الوہاب بدایونی از نسل شیوخ

صدیقی حمیدی بدایونی .... است عالم عامل و فقیہ کامل بود در علم حدیث و تفسیر و فرائض شان عظیم است و بکمال فصاحت و بلاغت تکلم می کرد" (ترجمہ قاضی عبدالوہاب بدایونی ص: ۱۵)

"قاضی غلام محمد ... معاصر وی قاضی مبارک والد فیضی و شیخ شمس الدین صدیقی المخاطب بہ جہجار خاں متخلص بہ زاہد بدایونی و ملا عبدالقادر فاروقی متخلص بہ قادری بدایونی مولف کشف الغطاء فی احوال اصحاب الصفاء بودند" (ترجمہ قاضی غلام محمد بدایونی، ص: ۱۸)

صفحہ ۲۹ پر کشف الغطاء پر حاشیہ لکھے جانے کی اطلاع ملتی ہے جس کا اوپر مذکور ہوا اور صفحہ ۳۰ پر ملا کی کتاب کے چند اوراق کا اصل متن حضرت علی احمد اللہ محدث بدایونی کے ترجمہ میں نقل کیا گیا ہے۔ جو ان بزرگ کے ایک مکتوب کا حصہ ہے۔

تاریخ بنی حمید کی اطلاع کے مطابق حضرت مولانا علی احمد اللہ محدث ؒ بدایونی (۱۱۴۰ھ-۱۲۳۰ھ) حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (ف ۱۸۲۴) کے تلمیذ اور مولانا فخر الدین اورنگ آبادی دہلوی (ف ۱۷۸۵ء) سے چشتیہ سلسلہ میں بیعت و خلافت رکھتے تھے۔ حافظ رحمت خاں روہیلہ (ف ۱۷۷۴ء) ان کے دست پر مشرف بہ بیعت ہوئے۔ انہوں نے اپنے مرشد کی ہدایت پر ہی بدایوں میں حضرت سید احمد بخاری ؒ (ف ۶۳۵ھ/۱۲۳۸ء) پدر بزرگوار حضرت نظام الدین اولیاء (ف ۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء) کی درگاہ اور مسجد تعمیر کرائی تھی۔ پیر اور مرید کے درمیان ربط و اتحاد تھا اور خط و کتابت تھی۔ حافظ الملک کے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے حضرت علی احمد اللہ محدث بدایونی نے ملا عبدالقادر بدایونی کی تالیف کشف الغطاء کا ترجمہ اپنے مکتوب گرامی میں شامل کیا تھا۔ یہ خط صاحب تاریخ بنی حمید کو

ایک خریطہ میں دستیاب ہوا۔ جس کو انہوں نے من وعن نقل کر دیا ہے، لیکن خط لکھنے کا مقام اور تاریخ اس میں مذکور نہیں۔ حضرت کا خط فارسی میں ہے اور ملا کی عبارت عربی میں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا علی احمد اللہ محدث بدایونی کے پیش نظر ملائے بدایونی کے تذکرے کا اصلی یا نقل شدہ متن تھا۔ واللہ اعلم۔ مکمل مکتوب حسب ذیل ہے:

والاقدر عالی شان نواب حافظ رحمت خاں زید اللہ حشمتہ و حفظہ اللہ حرمتہ۔ دعا ہای ترقی مناسب دنیا و ادعیہ افزونی مراتب عقبیٰ خوانده مطالعہ نمایند۔ الحمد للہ کہ الی الآن بیک پیراہن شب را بروز می آرم۔ و عافیت الیشان میخواہم۔ مکاتبہ ابتہاج حلہ وصول در بر کشید۔ قلب را مسرت تازه و جان را راحت بی اندازہ رسانید۔ مضامین مندمجہ اش من وعن پیوست۔ آرے بہ فقرا و صلحا اعتقاد داشتن و در ہر کار بآنہا رجوع آوردن دلیل فتح و نصرت است۔ چنین عقیده وارجاع را شعبہ اند و حمہ مدد غیبی تصور باید نمود۔ خدا کند کہ با این مزاج و عقیدت تادیر بزیاد۔ و بمآرب اقصیٰ کامیاب بماناد۔ و جواب امور مستفسره از کشف الغطا کہ سہل ترین عبارت او بست بعینہٖ نقل کرده اطمینان خاطر عاطر مینمایم۔ البتہ بعض امور و رموز عندالملاقات بالمشافہ دست کشف وطی بر سر خواہد نہاد۔ ع درین نکتہ ہست گر بشنوی، باید کہ ہمیشہ کارہای خود تفویض بہ کارسازی کارساز حقیقی ساختہ بحزم و احتیاط میکرده باشد بفضلہ کرمہ و منہ دعوتہ کامیاب خواہید گردید۔ وآن عبارت کتاب موصوف اینست قال صاحب کشف الغطا فی احوال اصحاب الصفا (وہو الذی یقال لہ ملا عبدالقادر القادری البدایونی) انہ: سمعت من اکابر البلد یاران فی ہذه البقعۃ المبارکۃ المشہورۃ ببقبۃ الاسلام المسماۃ بہ بلدۃ بداون قد استراح کثیر من اہل العرفان

لا یحصی عددهم فمن عدهم فیلے مبلغ علمہ۔ والاکثر منهم واحد الاسم
واللقب۔ فتمیزوا بینهم بالنسبۃ ۱۔ **فالسلطان ثلاثۃ) احدهم**
واعظمهم درجۃً ومنصبۃً من حضرۃ التقریب سلطان العارفین ویقال
لہ سلطانجی فهو الشهید الفخیم شیخ شاهی خواجہ السید حسن بن السید
اعزالدین احمد السهروردی موی تاب شاہ روشنضمیر قدس اللہ
سرہٗ۔ مراتبہ علیۃ لا یعثر علیها صنادید العارفین ولا یحیط بها
اسالیب الواصفین لو زبرتها السنۃ الاقلام لقصرت ولو نمعتها
انملۃ الانام لاعیت۔ مرقدہ مشهور فی الآفاق وراء نهر سوت (والثانی)
السلطان نصیرالدین الغازی المعروف بشیخ سلطان شیر چشتی فهو اکرم
ساداتنا الصوفیہ الجشتیہ المشهور بہ صاحب الولایۃ الثانی لاهل بداون۔
مرقدہ شرق الحصن علی مائتی اقدام او اکثر فی محلۃ جوگی پورہ تحت اشجار
التمر الهندیۃ فی العمارۃ المشهورۃ بخانقاہ چشت * * * * * *
(والثالث الآن) الشیخ السلطان الجشتی الفریدی رحمۃ اللہ علیہ فهو من
محترمی ذریۃ شیخ الاسلام مولانا الشیخ فرید الملۃ والدین الجشتی الفاروقی قدس اللہ
سرہ۔ ومرقدہ فی محلۃ خیل چشتیان علی فصیل الحصن فی العمارۃ المشهورۃ
بالاصطبل۔ **واما السلطان الحسینی** فلیس من هذا القبیل بل هو من معتقدی
سلطان العارفین۔ قبرہ فی القبۃ المشهورۃ علی نهر سوت۔ **۲۔ وصاحب**
الولایۃ ثلثۃ) مرۃ بعد اخری فالتصرف الآن بید الاخیر فهو یتصرف
حیث یشاء۔ **(احدهم واسبقهم)** مولانا الحاجی الشیخ سراج الدین

الترمذی۔ جامع الکمالات الصوریۃ والمعنویۃ قدس اللہ تعالیٰ سرہ۔
مرقدہ فی سواد بداون جانب الغرب دون عیدگاہ شمسی فی حریم السهروردی
مشهور۔ **(والثانی)** الشیخ السلطان شیر چشتی وقد مر ذکرہ۔ **(والثالث)**
الشیخ الجلیل خواجہ السید ابوبکر الملقب بہ بدرالدین بن السید اعزالدین
احمد السهروردی موی تاب ولذلک یقال لہ الثالث بالخیر وهو جامع الفضائل
السهروردیۃ والجشتیۃ ومنبع المعارف والحقائق ومرجع الخلائق فی الحل
والعقد یصدر احکام الدیار من حضرۃ الآن کما کان لانہ من مقبولی
الغوث الاعظم السید محی الدین ابی محمد عبد القادر الحنبلی الجیلانی
قدس اللہ سرهما۔ مرقدہ فی حریم السهرورد مشهور عند صاحب الولایۃ
الاول الشیخ المولانا سراج الدین الترمذی رجانب الشرق مائلاً الی الشمال۔
ش) ۳۔ **(والحسن ثلثۃ) احدهم وارفعهم** خواجہ سید حسن شیخ
شاهی موی تاب سلطان العارفین رحمۃ اللہ علیہ وقد ذکر آنفاً۔ **(والثانی)**
الشیخ الحسن المکی ویقال لہ شیخ مکہ و پیر مکہ فهو قطب الوقت من متبعی
شیخ الآفاق قطب الکونین خواجہ معین الدین الحسن السنجری الجشتی الاجمیری
ولی الهند قدس اللہ سرہ۔ ومرقدہ غرب الحصن مشهور فی الحریم۔
(والثالث) خواجہ حسن افغان طوسی بخشی بداون قد نفذت احکام
صاحب الولایۃ الآن علی یدیہ فهو صاحب العلامات الباهرۃ من متبعی
الشیخ بهاء الدین ذکریا الملتانی قدس سرہ۔ مرقدہ فی سواد بداون
جانب الشرق مائلاً الی الشمال علی غدیر مشهور بہ چند وکهرتال۔ ۴۔

(والعلى اربعة) احدهم واعظمهم على البخارى والد السيد احمد البداونى رحمة الله عليهما۔ مرقده مشهور على غدير يقال له ساگرتال فى حريم الشهيدين المشهورين به سرخ پوش وسبز پوش۔ وهو اول بيت بنا الغازى ملك قطب الدين ايبك فى عهد نظامته واقدم تعميراً من حريم اربعين شهداء (چهل شهيد) الذى فى قفاء المسجد المشهور الآن به مسجد سيد مهر على وهو الذى عمره القاضى محمد جليس البداونى عند دار قضائه ش۔ (والثانى) على موله كبير وهو المشهور بعلى موله بزرگ فهو قطب الوقت من متبعى الشيخ الجلال الدين التبريزى قدس الله اسرارهما مرقده فى جوار سلطان العارفين جانب الغرب۔ (والثالث) على موله صغير وهو المشهور بعلى موله خورد رحمة الله عليه۔ مرقده مشهور فى الحصن عند حريم السيد عبد الله الشهيد الملقب بمير ملهم نور الله مرقده فى حريم المسجد الجامع القطبى على جنب السيد شريف صاحب سلسلة الحديد المشهور بسيد شريف بيڑى والا۔ ش (والرابع) على شوريده عليه الرحمه۔ مرقده فى سواد بداون جانب الشمال على خمسة فراسخ فى موضع يقال له ريمه ويشتهر بقبر سلا بير۔ ۵۔ (واحمد ثمانية) احدهم سيد افراد بداون وهو السيد احمد البخارى البداونى لا يحصى مراتبه فهو اعظم درجةً ورفعة۔ رحمة الله عليه۔ مرقده فى جنب والده على غدير يقال له ساگرتال فى حريم مشهور۔ واما بقية السبعة فمحكوم لهم وهم افراد بداون واهل الخدمة فقد اتفق القدماء انه لم يجتمع مثلهم فى

البلاد۔ وكانوا مرجع الخلائق ومفتخر الديار ومامورين من الله لقضاء الحاجات ودفع الكروب ورفع المصائب۔ قد اجزت لحضرتهم من الشيخ الاجل والفاضل الاكمل العلامة الفهامة مخدومى ومولائى الشيخ عبد الله الملقب به عارف بالله الچشتى البداونى زاد الله بركاتهم علينا وعلى جميع المحبين المخلصين آمين۔ (فاحدهم) احمد بهرتول رحمة الله عليه۔ صاحب الهمة وكشف الغمة۔ مرقده فى مسكنه وهو محله بهرتول فى جوار حريم السيد عبد الله الشهيد الملقب به مير ملهم نور الله مرقده (وثانيهم) احمد ذكى نهر والى (باللام وليس بالنون) هاتان النسبتان فيه بحسب الذكاوة وسكونته سابقاً فى مقام نهر واله گجرات۔ مرقده فى الحصن على بير السمكة (وثالثهم) احمد مجرد مشهور به چرم پوش ويعرف به احمد بودله۔ رحمة الله عليه۔ مسكنه فقاء المسجد الجامع الشمسى لا القطبى۔ مرقده فى جنب الشيخ بودله جانب الغرب۔ (ورابعهم) احمد خندان قد اشتهر به لكثرة التبسم عند التكلم رحمة الله عليه۔ مرقده فى محلته سوته قريب مسجد السيد عرب البخارى فى حريم قديم مشهور۔ وفى هذا ادسكفته (اى العتبه كان يعتكف مولانا علاء الدين الاصولى ويقرع القران فى الليل الى الصباح۔ (وخامسهم) احمد النورى يتميز باشراق الوجه وكان امياً رفيق السيد محمد نظام الاولياء محبوب الهى البداونى قدس الله سرهما۔ مرقده فى سواد بداون جانب الجنوب من الحصن على مائتى اقدام او اكثر من طين مسومة۔ (وسادسهم) احمد معشوق قندهارى وهو الحبيب الربانى ومجاب الدعوات۔

من متبعی الشیخ صدر الدین العارف الملتانی السهروردی رحمۃ اللہ علیہما لکنہ لو یستحسن رجوعات الخلق الیہ فلذلک اللہ تعالیٰ قد اخفی مرقدہٗ من ماء نہر سوت (ای فقاء سلطان العارفین مائلاً الی الشمال) واما احمد تفتہ ویقال لہ احمد تختہ فہو لیس من ہذا القبیل بل ہو من رفقاء سلطان العارفین۔ ولکن اکابر المتاخرین اجازوا محل احمد معشوق زیارتہ ووجدوا فیہ تاثیراً عظیماً کاملاً رحمۃ اللہ علیہ۔ مرقدہٗ فی جوار سلطان العارفین جانب الجنوب۔ (وسابعہم) احمد خیاط وکان کسبہ الخیاطۃ رحمۃ اللہ علیہ۔ مرقدہ مشہور ما بین حریو مرقد السید ابی بکر الملقب بہ بدر الدین موی تاب صاحب ولایۃ بداون ومعلمہ الحاجی جمال الدین الملتانی البداونی المشہور بقاضی حسام الدین الملتانی رحمۃ اللہ علیہما تحت شجرۃ پیپری۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد والہ واصحابہ واولیاء امتہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔ انتہی کلامہ

ان شواہد کی روشنی میں یہ امر قابل یقین ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی نے کشف الغطاء تصنیف کی تھی جو بدایوں میں موجود تھی اور جس سے بدایوں کے مولفین نے استفادہ کیا۔ بہ صورت موجودہ اس کی تلاش جاری رہنا چاہیے، اس کے جو فارسی اور انگریزی ترجمے انگلینڈ میں شایع ہوچکے ہیں، ان کا برآمد ہونا بھی ضروری ہے لہذا ان کو بھی تلاش کیا جائے۔

اگر کشف الغطاء کا نسخہ یا اس کے متن کی نقل یا اس کا فارسی و انگریزی ترجمہ دستیاب ہوگیا تو اس مضمون کو تحریر کرنے کا مقصد پورا ہوجائے گا۔

حواشی

[1] (حضرت شاہ) محمد دلدار علی مذاق بدایونی (۱۸۱۹-۱۸۹۴ء) تلمیذ ذوق دہلوی۔ مذاق طبعاً و عملاً صوفی شاعر تھے۔ بدایوں میں انہوں نے سلسلہ مذاقیہ کی بنا ڈالی۔ تلامذہ کی تعداد کثیر تھی۔ دو تذکرے مذاق سخن از عبدالحئی صفا (بدایوں ۱۸۸۱) اور تذکرہ بہار بوستان شعراء (بدایوں ۱۸۸۲) شایع ہوچکے ہیں [2] محمد ابرار علی (پیدائش ۱۹۲۴) آج کل کراچی میں مقیم ہیں، اپنے جد امجد حضرت مذاق بدایونی کی سوانح باسم "آئینہ دلدار" (کراچی ۱۹۵۶ء) کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہیں [3] باقیات الصالحات، طفیل احمد صدیقی و انصار حسین زلالی۔ بدایوں ۱۸۹۷، متعلق خاندان متولی، کلمہ باقیہ، شیخ کبیر الدین متولی، بدایوں ۱۹۳۷، متعلق خاندان متولی۔ انساب شیوخ شوالی بدایونی، محمد رضی الدین بسمل، شاہ آباد ۱۸۹۹، متعلق خاندان فرشوری، عمدۃ التحقیق فی آل سیدنا الصدیق، حمید الدین دانشمندی، بدایوں ۱۳۳۲ھ/ ۱۴-۱۹۱۳، متعلق دانشمندی، اکمل التاریخ ۲ جلد، محمد یعقوب ضیاء القادری بدایونی ۱۹۱۵، ۱۹۱۶، متعلق خاندان عثمانی، تاریخ بنی حمید (اردو) انشاء اللہ، بدایوں ۱۳۳۵/ ۱۷-۱۹۱۶ء، متعلق خاندان حمیدی [4] گمسی نے بھوس کے چھپر میں مدرسہ قائم کیا، ملا نے مدرسہ حسن (۹۶۹ھ) سے تاریخ نکالی۔ ابوالفضل نے جب اپنے والد شیخ مبارک کے انتقال پر بعد اکرائی، ملا نے فی البدیہہ تاریخ کہی۔ موتراش چند (۱۰۰۴ھ) منتخب التواریخ کی تاریخ لاجواب کہی ہے۔ انتخابے کہ ندارد ثانی۔ لفظ انتخاب سے ن اور ی کے عدد محذوف کر دیے جائیں تو تاریخ برآمد ہوجاتی ہے (۱۰۰۴ھ) [5] یہ دونوں اقتباس بالترتیب تجلیات سخن (بدایوں ۱۹۳۰ ص: ۵۹، ۶۰) پر بھی درج ہوئے ہیں [6] کسی دوسرے ماخذ سے ان بزرگ کا حافظ رحمت خاں کا مرشد ہونا ثابت نہیں۔

اردو کے ادبی رسائل وجرائد کا ایک اہم مسئلہ ـ قارئین

از:

ضیاء الدین اصلاحی

" یہ مقالہ اسی موضوع پر ہونے والے اتر پردیش اردو اکاڈمی کے سمینار منعقدہ ۱۶ اگست ۹۸ء کو پڑھا گیا تھا، بعض دوستوں کی خواہش پر اسے معارف میں شایع کیا جاتا ہے۔" (ض)

(۱)

اردو کے ادبی رسائل وجرائد کے مسائل متعدد اور گوناگوں ہیں اور یہ سب ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں، مگر سہولت، وضاحت اور اختصار کے خیال سے بحث کا دائرہ سمیٹنا اور کسی ایک ہی مسئلہ تک گفتگو کو محدود رکھنا مفید اور مناسب ہوگا۔

ادبی رسائل وجرائد کا ایک خاص مسئلہ ان کے قارئین کا ہے میں اسی کے تعلق سے اپنے ناچیز خیالات پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

یہ اور ادبی رسالوں کے دوسرے مسائل اصلاً اردو زبان سے جڑے ہوئے ہیں، جس کا ستارہ ہندوستان کی آزادی کے بعد ہی سے گردش میں آگیا ہے، ہندوستان کی تقسیم ہماری تاریخ کا بڑا دردناک سانحہ ہے، اس سے اردو سماج میں عجیب کشمکش پیدا ہوگئی ہے، اردو کے خاص مرکز اتر پردیش میں اس پر زیادہ تباہی آئی، ۱۹۴۷ء کے بعد اس ریاست میں بننے والی حکومتوں نے اردو کو مٹانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا، پرائمری اسکولوں میں

اردو کی تعلیم بند کر دی گئی اور تعداد وغیرہ کا ایسا گورکھ دھندا شروع ہوا کہ عملاً اردو تعلیم کے سارے مواقع ختم ہوگئے، اسی کی تقلید پڑوسی ریاستوں بہار، مدھیہ پردیش اور راجستھان نے کی۔ جہاں آزادی سے پہلے اردو کا چلن تھا۔ متحدہ ہندوستان میں پنجاب اردو کا بڑا مرکز تھا، اس کا آدھا حصہ پاکستان میں چلا گیا اور جو باقی بچا وہاں جلد ہی اردو کا رواج ختم اور پنجابی کا بول بولا ہوگیا، پھر پنجابی اور ہندی کا تنازعہ شروع ہوا جن کی لڑائی اردو میں لڑی گئی۔ نوبت بایں رسید کہ بچے کھچے پنجاب کو تین حصوں میں بانٹ دیا گیا، پنجاب میں پنجابی اور ہریانہ اور ہماچل پردیش میں ہندی کر دی گئی، لیکن اس بندربانٹ میں اردو کو جو ان علاقوں کی خاص زبان تھی کہیں جگہ نہ مل سکی۔

شمالی ہند میں ایسا ماحول بنایا گیا کہ اردو ایک مخصوص فرقہ ومذہب کے لوگوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے، لیکن اردو تعلیم ختم کر کے اس مذہب وفرقہ کے بچوں کو بھی اردو تعلیم حاصل کرنے سے محروم کر دیا گیا۔

جنوبی ہند میں اردو کے خلاف شدید تعصب نہ تھا، لیکن آندھرا کے علاوہ کسی صوبے میں اردو بولنے والوں کی آبادی زیادہ نہیں تھی۔ مہاراشٹر میں پانچ، چھ فیصدی اردو بولنے والے تھے، یہاں اردو کی پوزیشن برقرار رہی، اردو میڈیم اسکول باقی رہے اور اسکولوں میں اردو تعلیم کا رواج بھی قائم رہا۔ مدراس کی حالت بھی ٹھیک رہی لیکن یہاں اردو بولنے والوں کا تناسب اور بھی کم تھا۔ پورے ہندوستان میں آندھرا ہی وہ علاقہ تھا جہاں یونیورسٹی سطح تک اردو کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال کرنے کا کامیاب تجربہ جامعہ عثمانیہ میں کیا گیا، لیکن انڈین یونین میں ریاست کے الحاق کے بعد ذریعۂ تعلیم اردو کے بجائے انگریزی کر دیا گیا۔ اس ریاست میں اردو کی بڑی اور قابل لحاظ آبادی تھی لیکن اس کو تین ریاستوں میں تقسیم

کر دیا گیا اور جب نئی ریاست آندھرا پردیش وجود میں آئی تو اردو والے اس میں اور کرناٹک اور مہاراشٹر میں تقسیم ہو کر ایک چھوٹی سی لسانی اقلیت بن کر رہ گئے۔

پورے ملک میں صرف جموں وکشمیر ہی مستثنیٰ ہے۔ وہاں کی سرکاری زبان اردو ہے۔ گو اردو سارے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، تاہم ریاستوں کی تشکیل کے طریقوں اور بعض دوسرے عوامل کی بنا پر وہ ہر جگہ لسانی اقلیت میں تبدیل ہو گئی اور اردو والوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم کا سرے سے موقع ہی نہ مل سکا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اردو کا اپنا کوئی خاص علاقہ ہی نہیں ہے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں اردو پر یہ افتاد بھی آئی کہ ہندوستان میں اردو کے دو بڑے اور عظیم الشان ادارے انجمن ترقی اردو ہند اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کو آگ لگادی گئی اور حیدرآباد کا دارالترجمہ جلا دیا گیا، جس کے نتیجے میں لاکھوں روپے کی کتابیں راکھ کا ڈھیر ہو گئیں۔

یہ حکایت ذرا دراز ہو گئی لیکن اس سے خود ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ جب اردو تعلیم کے مواقع ختم کر دیے گئے اور عملاً اردو پڑھنا لکھنا موقوف ہو گیا، بڑے بڑے کتب خانے نذرِ آتش کر دیے گئے تو اردو کے نئے قارئین کس طرح پیدا ہو سکتے تھے اور پرانے قارئین عمر نوح لے کر تو آئے نہیں تھے، جو گنے چنے رہ گئے تھے ان کے پڑھنے کے لیے کتابیں اور رسالے موجود نہیں، اس صورتِ حال کے نتیجے میں شمالی ہند سے خاص طور پر اردو رفتہ رفتہ ختم ہونے لگی اور اردو کے ادبی رسالے پڑھنے والے بھی خال خال رہ گئے، کہا جاتا ہے کہ شمالی ہند میں مدارس بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور ان ہی کی بدولت کچھ اردو پڑھنے والے باقی رہ گئے ہیں، مگر مدارس کے اردو پڑھنے والے اردو کے ادبی رسائل وجرائد

کم پڑھتے ہیں، وہ دینی و مذہبی رسائل وجرائد کے مطالعہ سے زیادہ شغف رکھتے ہیں۔ ذیل میں قارئین کے مسئلہ پر جو کچھ عرض کیا جائے گا اس میں اردو اور اس کی تعلیم کا ذکر بھی بار بار آئے گا، کیونکہ رسالوں کے سارے مسئلے اس سے جڑے ہوئے ہیں، اس لیے تکرار کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

(۲)

شمالی ہند میں آزادی سے قبل ہر مذہب کے طالب علم اردو پڑھتے تھے لیکن آزادی کے بعد ایسی صورت پیدا کر دی گئی کہ اردو تعلیم ایک مخصوص مذہب کے لوگوں ہی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور چونکہ اسکولوں میں اردو کی تعلیم ختم کر دی گئی ہے اس لیے اس مذہب کے بچے بھی اردو تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے یا جو لوگ بھی اردو پڑھنے کے خواہش مند ہوتے تھے ان کے لیے اردو پڑھنے کے مواقع مسدود کر دیے گئے۔

سرکاری اسکولوں میں اردو تعلیم ہی ختم نہیں کی گئی بلکہ ایک مخصوص کلچر بچوں پر تھوپنے کی کوشش کی گئی، اس کی وجہ سے مسلمان طالب علموں نے ان اسکولوں کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا اور آزاد دینی مکاتیب قائم کر کے ان میں تعلیم حاصل کرنے لگے، جن میں اردو بھی پڑھائی جاتی تھی، ان میں سے کچھ طلبہ آگے چل کر اسکولوں اور کالجوں میں بھی اردو پڑھتے تھے۔

اس طرح مسلمانوں میں تو اردو کے کچھ قاری پیدا ہو جاتے ہیں لیکن ہندوؤں میں اردو کی خواندگی بالکل موقوف ہو چکی ہے، تقسیم کے وقت اردو کے غیر مسلم قارئین کا جو تناسب تھا وہ اب نہیں رہا، تقسیم سے پہلے پنجاب، ہریانہ، دہلی، اترپردیش، راجستھان، کشمیر، حیدرآباد اور بھوپال میں اردو کا غلبہ اور غیر مسلم اردو قارئین کی بہت بڑی تعداد تھی، لیکن اب ان جگہوں پر ان کی تعداد برائے نام رہ گئی ہے اور نئی نسلیں اردو سے بالکل ہی

نابلد ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اردو کے ادبی رسائل وجرائد اپنے قارئین کے بڑے طبقے سے محروم ہوگئے۔

(۳)

اردو بلالحاظ مذہب وعقیدہ تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان تھی مگر حالات اس طرح کے بنا دیے گئے ہیں کہ وہ ایک خاص مذہب وعقیدہ کے لوگوں تک محدود رہ گئی ہے، اس وجہ سے اردو پڑھنے والوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہوگئی ہے لیکن مسلمانوں میں دوسری قوموں کے مقابلے میں تعلیم کا تناسب کم ہے، ان کی ساٹھ فیصدی سے زیادہ آبادی ناخواندہ ہے اور تعلیم یافتہ طبقہ میں ۵ فیصد وہ لوگ ہیں جو انگریزی کے ایسے شیفتہ اور دلدادہ ہیں کہ اپنے بچوں کو انگلینڈ بھیجنے سے کم پر راضی نہیں ہوتے اور اردو کے ادبی رسائل وجرائد تو درکنار اردو اخبار پڑھنا بھی کسر شان سمجھتے ہیں، انگریزی کا جنون انہیں اپنی مادری زبان کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتا۔

اب جو تعلیم یافتہ طبقہ بچ گیا ہے اس میں اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کو علم وادب کا بلند اور اعلیٰ ذوق نہیں ہوتا اور نہ اردو کے علاوہ اسے کسی اور زبان کی شدبد ہوتی ہے، اس لیے اردو زبان اور رسالے پڑھنے کے لیے وہ مجبور ہوتا ہے، لیکن چونکہ اس کا ذوق پختہ اور معیاری نہیں ہوتا اس لیے فنی، ادبی، ثقافتی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین پڑھنے سے اس کو کوئی رغبت اور دلچسپی نہیں ہوتی، وہ سطحی، ہلکی پھلکی اور چٹ پٹی چیزیں پڑھنے کا شوقین ہوتا ہے، سنسنی خیز خبروں، سیاسی تجزیوں اور تبصروں سے اسے جذباتی آسودگی اور تسکین ملتی ہے، یا پھر فلمی، جاسوسی اور عشق و رنگینی میں ڈوبے ہوئے رسالے اس کے لطف و سرور کا سامان ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں اردو قارئین کا بڑا

طبقہ بھی اردو کے معیاری اور بلند پایہ ادبی وعلمی رسالوں کا قاری نہیں بن پاتا۔

اچھا علمی وادبی ذوق جو اعلیٰ تعلیم سے پیدا ہوتا ہے، وہ ایک قلیل اور محدود طبقے ہی میں ہوتا ہے، یہی اگر احساس کمتری کا شکار اور اردو پڑھنے کو عار نہ سمجھے تو ادبی وعلمی رسالوں کا قدرداں ہوسکتا ہے۔

(۴)

مسلمانوں میں جو لوگ صنعت وحرفت اور مختلف پیشوں سے وابستہ ہوتے ہیں وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم نہیں دلاتے کہ ان میں علم وادب کا ادبی ذوق پیدا ہو۔ ان کے خیال میں اعلیٰ تعلیم سے کہیں زیادہ ان کی یافت اور آمدنی کا ذریعہ خود ان کا کاروبار ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے بچوں کو دسویں یا بارہویں جماعت تک تعلیم دلاکر ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع کر دیتے ہیں اور انہیں کاروبار میں لگا دیتے ہیں، جس میں ان کا مالی فائدہ زیادہ ہوتا ہے، دراصل تعلیم کو کمائی کا ذریعہ خیال کیا جاتا ہے اور جب وہ اس کا ذریعہ نہیں بنتی تو اسے بے سود سمجھا جاتا ہے، اسی لیے مسلمانوں میں تعلیم چھوڑنے کا اوسط زیادہ ہے، وہ عموماً پانچویں اور چھٹی جماعت یا حد سے حد دسویں اور بارہویں جماعت کے بعد تعلیم چھوڑ کر اپنے والدین کے ساتھ کام میں لگ جاتے ہیں یا دوسروں کے یہاں جاکر کوئی ہنر سیکھنے لگتے ہیں تاکہ آئندہ معاشی ترقی کی راہ ہموار ہوجائے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کے لوگوں کے بچے اگر زیادہ تعلیم حاصل کر لیتے ہیں تو پھر وہ اپنے خاندانی روایتی پیشوں سے وابستہ ہونا پسند نہیں کرتے اور جب وہ نہ اِدھر کے ہوتے ہیں اور نہ اُدھر کے، تو انہیں خیال ہوتا ہے کہ "نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کماتے"۔

قصہ کوتاہ یہ کہ مسلمانوں کا یہ طبقہ بھی ادبی رسائل وجرائد کا قاری نہیں ہوتا۔

اسی ضمن میں یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ اب ملک میں انگلش میڈیم کے ذریعے تعلیم دلانے کی وبا پھوٹ پڑی ہے کیونکہ اسے اعلا تعلیم اور اچھی ملازمت کا وسیلہ خیال کیا جاتا ہے، اردو میڈیم کے اسکول بعض ریاستوں جن میں اتر پردیش بھی ہے، نہیں کے برابر ہیں۔ لیکن جہاں ہیں وہاں مسلم روسا و زعما ان کے بجائے انگریزی میڈیم اسکول قائم کرکے ان ہی میں اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طبقہ کی مالی حالت بہتر اور اچھی ہوتی ہے اور اس میں قوت خرید بھی ہوتی ہے وہ بھی اردو سے دور ہوگیا ہے جس کی زد اردو کے ادبی رسالوں پر پڑنا ناگزیر ہے۔ غرض اردو والوں کی پس ماندگی اور خوشحالی دونوں ہی انہیں ادبی رسائل و جرائد کا قاری بننے میں مانع ہوتی ہے۔

اس موقع پر یہ عرض کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کمسنی ہی میں بچے نرسری اسکولوں میں داخل کردیے جاتے ہیں جہاں اردو تعلیم کا بندوبست نہیں ہوتا، جو نرسری اسکول مسلمانوں کے زیر انتظام ہوتے ہیں ان میں بھی اردو کی حیثیت برائے بیت ہوتی ہے، اونچے گھرانے کے لڑکے کانونٹ میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں، ان میں مقابلے کے سخت امتحانات ہوتے ہیں جن میں کامیابی کے بعد ہی داخلے ہوتے ہیں، جو بچے ناکام ہوجاتے ہیں یا جن کے والدین کانونٹ کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے، وہی ادھر ادھر راہیں تلاش کرتے ہوئے اردو پڑھنے کی طرف بھی مائل ہوجاتے ہیں، اس طرح کے عسیر الحال اور معمولی ذہن والے طلبہ میں اردو کا اچھا علمی و ادبی ذوق نہیں پیدا ہوپاتا، نتیجہ یہ ہے کہ ایسے اردو خواں بھی ادبی رسائل و جرائد کے قاری نہیں ہوتے۔

(۵)

اردو کی جس اعلیٰ تعلیم کا ذکر ہو رہا ہے، کہا جاتا ہے کہ آزادی کے بعد اس میں اضافہ

ہوا ہے، ایک واقف کار کا بیان ہے کہ اردو میں الگ سے اعلا تعلیم کا انتظام آزادی سے پہلے ہندوستان کی دس پندرہ یونیورسٹیوں ہی میں تھا جن میں شعبۂ اردو علحدہ شعبہ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ عام طور پر اردو، فارسی، عربی اور اسلامی علوم کا شعبہ مشترکہ ہوا کرتا تھا، ۱۹۵۴ء میں دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو الگ سے قائم ہوا اور اب ۲۲۲ یونیورسٹیوں میں سے ۵۰ سے زیادہ یونیورسٹیوں میں الگ اردو کے شعبے قائم ہوگئے ہیں، ملک کے آٹھ ہزار چھ سو تیرہ کالجوں میں سے ہزار ڈیڑھ ہزار کالجوں میں اردو کے شعبے ہیں۔ حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی ختم کردی گئی مگر اب وہاں مولانا آزاد یونیورسٹی کا قیام عمل میں آگیا ہے، جو زبان کے ساتھ ساتھ ہر طرح کی تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم بذریعہ اردو دے گی۔

اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ متحدہ ہندوستان میں چاہے اردو بولنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ رہی ہو لیکن اونچے کلاسوں میں اُس وقت اردو کی تعلیم زیادہ رائج نہیں تھی، ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ساڑھے تین کروڑ سے زیادہ لوگوں کی زبان اردو ہے، شرح تعلیم میں بھی خاصا اضافہ ہوا ہے اور آج یہ شرح بڑھ کر ۵۵ فیصدی ہوگئی ہے۔

یہ بات درست ہے کہ آزادی کے معاً بعد گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کلاسوں میں اردو طلبہ کی تعداد بہت قلیل ہوگئی تھی، اس کے مقابلے میں اب اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بعض وجوہ سے جن کا ذکر آگے آئے گا، اردو کا چلن کچھ زیادہ ہوا ہے، ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے لکھے جارہے ہیں، لیکن اس تناسب سے ادبی رسائل و جرائد کے قارئین میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے، اس کی ۲ وجہیں ہیں:۔

اصل مسئلہ ابتدائی اور بنیادی تعلیم کا ہے جس کی جڑ ہی کاٹ دی گئی ہے اور جس پر وہ لوگ بھی جن کی مادری زبان اردو ہے ضروری حد تک توجہ نہیں دے رہے ہیں، اس کے نتیجے میں وہی بات سامنے آتی ہے کہ ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج　　تا ثریا می رود دیوار کج

دوسری وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد اردو کا تعلیمی معیار بہت فروتر ہوا ہے، خود تمام درس گاہوں اور دانش کدوں کا تعلیمی معیار نہایت پست ہو گیا ہے، اردو لینے والے طلبہ اس کی تہذیب سے ناآشنا ہوتے ہیں، اردو الفاظ کے صحیح تلفظ اور ان کے محل استعمال سے بے بہرہ ہوتے ہیں، اس طرح کے تعلیم یافتہ لوگوں سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اردو کے سنجیدہ، باوقار علمی و ادبی رسالوں کے قاری بنیں گے۔

(۶)

یہ بات سے بات نکلتی ہے، معیار کی اس پستی اور بے ذوقی کے ساتھ ہی دورِ حاضر کے پُر آشوب حالات، زندگی کے گوناگوں مسائل اور الجھنوں نے بھی لوگوں کے ذوقِ مطالعہ کو متاثر کیا ہے اور وہ سنجیدہ اور اعلا ادب کے مطالعہ کے عادی نہیں رہے، مشاغلِ حیات کی زیادتی اور وقت کی کمی کے باعث فرصت اور سکون کے لمحات میسر نہیں آتے، تھکے ہارے، منتشر اور پراگندہ ذہن کا آدمی دل و دماغ کو بوجھل کرنے والے لٹریچر کیسے پڑھ سکتا ہے، وہ ہلکے پھلکے، دلچسپ اور تفریحی لٹریچر سے اپنی تکان دور کرنے کا متمنی ہوتا ہے، غمِ روزگار اور کشاکشِ حیات میں گرفتار کو مطالعہ کی فرصت کہاں ملتی ہے، اگر اتفاق سے فرصت و فراغت کے چند لمحات نصیب ہوتے ہیں تو وہ فلمی اور سنسنی پیدا کرنے والے اخبار و رسالے، جاسوسی اور جنسی ناول و افسانے پڑھ کر اپنا دل بہلا لیتا ہے، غرض مذاق کی پستی،

سطحیت پسندی اور زندگی کی کشاکش نے سنجیدہ علمی و ادبی رسائل و جرائد کے قارئین کی تعداد محدود کر دی ہے۔

(۷)

رزق و معاش کا مسئلہ ہر زمانے میں اہم رہا ہے، اس زمانے میں اس کی اہمیت خصوصیت سے بڑھ گئی ہے، آزادی کے بعد چونکہ اردو کا ناتہ روزگار اور معاش سے کاٹ دیا گیا ہے، اس لیے اردو کے قارئین بہت کم ہوتے گئے، اور جو اصحابِ ذوق واقعی اردو کے ادبی و علمی رسائل پڑھنے کے آرزومند ہوتے تھے، وہ معاشی طور پر کمزور ہونے کی وجہ سے انہیں خرید نہیں سکتے تھے، آج جو اسکولوں اور کالجوں میں اردو پڑھنے کا رجحان بڑھا ہے اور طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ اردو پڑھنے والے کو اس سے روزگار اور نوکری ملنے کی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں، بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے اور اتر پردیش کے مقابلے میں اردو کے ساتھ بہتر سلوک بھی ہے، اردو ٹیچر بھی مقرر ہو رہے ہیں، ابھی دو ماہ قبل راقم کو وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا تو لوگوں نے بتایا کہ غیر مسلموں میں پنڈت حضرات کا رجحان بھی اردو پڑھنے پڑھانے کی جانب ہوا ہے:

ع　چشم ما روشن دلِ ما شاد

بہرحال اردو ادب جس طبقہ کی زبان سمجھی جاتی ہے وہ اقتصادی طور پر بہت پس ماندہ ہے، اسی لیے بچوں کی تعلیم کا رواج اس میں کم ہے، وہ روٹی روزی کے چکر میں کم عمری ہی سے اپنے بچوں کو کسی نہ کسی کام میں لگا دیتے ہیں، آخر اس طرح کے بچے آئندہ ادبی رسائل و جرائد کے قاری کیسے بن سکتے ہیں یا پھر علم و ادب کا شوق رکھنے کے باوجود وہ ادبی رسائل و جرائد خریدنے کی قوت نہیں رکھتے۔

(۸)

روز بروز بڑھنے والی مہنگائی نے بھی لوگوں کی کمر توڑ دی ہے، اس کا اثر ادبی رسالوں پر بھی پڑا ہے جس کے قارئین کی بنیادی ضرورتیں بڑھتی ہوئی مہنگائی کی وجہ سے پوری نہیں ہو رہی ہیں تو وہ رسالے کیسے خرید سکتے ہیں۔ گرانی ہی سے تعلق رکھنے والی یہ بات بھی ہے کہ ڈاک کے مصارف بہت بڑھ گئے ہیں، اس کی وجہ سے قارئین ادبی رسائل کی خریداری سے ہاتھ کھینچتے جارہے ہیں۔

رسالوں ہی کے نہیں اردو کے قارئین کی معتدبہ تعداد پاکستان، عرب اور یورپ کے ملکوں میں آباد ہوگئی ہے مگر ہندوستان و پاکستان میں مواصلات کا نظام ہمیشہ سے دشوار اور پیچیدہ رہا ہے اس لیے پاکستان کا اردو خواں طبقہ بھارت کے رسالے خریدنے کا خواہش مند ہوتے ہوئے بھی ان کو خرید نہیں پا رہا ہے، پاکستان اور دوسرے بیرونی ملکوں کا ڈاک خرچ اتنا بڑھ گیا ہے کہ رسالے کی قیمت سے زیادہ ڈاک پر خرچ آتا ہے، ایسی صورت میں وہاں کے خریدار بھی ہمت ہار بیٹھتے ہیں، اسی ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ادھر برسوں سے ڈاک کا نظام بہت خراب ہوگیا ہے، اولاً تو ڈاک بہت تاخیر سے پہنچتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ سرے سے پہنچتی ہی نہیں۔ یہ صورت بھی ادبی رسالوں کے قارئین کو متنفر کرنے والی ہے۔

(۹)

اردو رسالوں کے قارئین کو خرید کر پڑھنے کی عادت نہیں، ادبی رسالے اپنی خستہ حالی کے باوجود بڑے اور معمر شاعروں، ادیبوں، نقادوں اور معروف اہل قلم کو اعزازی بھیجے جاتے ہیں، اکثر تو واقعی اس کے مستحق ہوتے ہیں کیونکہ ان میں قوت خرید نہیں ہوتی لیکن جو لوگ خریدنے کی قوت و استطاعت رکھتے ہیں وہ بھی اعزازی رسالے کے طالب ہوتے ہیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ نئے اور معمولی درجہ کے ادیب و شاعر بھی اس کے متوقع رہتے ہیں کہ ان کو رسالے مفت بھیجے جائیں، اسی طرح یونیورسٹیوں کے پروفیسر، ریڈر، لکچرار اور عربی درسگاہوں کے معلم، طلبہ کے انجمنوں کے سکریٹری اور نگراں سب اعزازی طور پر رسالے جاری کرانے کے متمنی ہوتے ہیں اور اس کو اپنا حق سمجھتے ہیں، حالانکہ یونیورسٹیوں سے وابستہ حضرات خرید کر رسالے پڑھنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں اور اب عربی مدارس کا حال بھی بہت اچھا ہے، جس کا اندازہ ان کی شاندار عمارتوں اور جلسے جلوس اور دوسری تقریبات کے موقع پر ان کے بے دریغ اخراجات سے ہوتا ہے، لیکن اردو کے ادبی و علمی رسائل خریدنے کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں ہوتے۔

(۱۰)

یہ باتیں ادبی رسائل کے قارئین سے براہ راست متعلق تھیں۔ اب بعض باتیں خود رسالوں کی کمی اور کوتاہی کے بارے میں عرض کی جاتی ہیں، اگر ان کی تلافی کر دی جائے تو رسالوں کے خریدار اور قاری بڑھ جائیں گے۔

۱۔ کہا جاتا ہے کہ عموماً ادبی رسائل تنوع اور ترتیب و ہیئت کی جدت سے خالی ہوتے ہیں، ان کی پیش کش کا انداز اور مواد یکساں ہوتا ہے، اگر ہر ادبی رسالے باہم کسی قدر مختلف ہوں اور ان میں تنوع، رنگارنگی اور جدت کا خیال رکھا جائے تو یہ قارئین کے لیے پرکشش، دل آویز اور دلچسپ ہو جائیں گے اور ان کی تعداد اشاعت بھی اس کی وجہ سے بڑھ جائے گی۔

۲۔ اردو کے ادبی رسائل سے یہ شکایت بھی ہے کہ وہ قارئین کے مذاق و مزاج کی رعایت نہیں کرتے۔ ان کے مواد و مشمولات قارئین کی طبیعت و رجحان سے ہم آہنگ

نہیں ہوتے، ان کو اپنے مقصد اور ستھرے ادب کو پیش کرنے کے ساتھ ہی عام قارئین کو مشتاق بنانے والی چیزیں بھی رسالے میں شامل کرنی چاہیے۔ ادبی رسالے اگر وقت کے مزاج کو نہیں پہچانیں گے اور قارئین کی نفسیات کا خیال نہیں کریں گے تو بے توجہی کا شکار ہوں گے۔ اس لیے اپنے مقصد و معیار کو برقرار رکھتے ہوئے وہ قارئین کی جاذبیت اور دلچسپی کا سامان کریں تاکہ ان کا حلقہ وسیع ہو۔

۳۔ کہا جاتا ہے کہ اردو رسائل لیتھو کی طباعت، کتابت کی خرابی، گٹ اپ کی بدصورتی اور جدید فن طباعت سے عاری ہونے کی بنا پر دلکش اور جاذب نظر نہیں ہوتے اس لیے اس فرسودہ طریقۂ طباعت کو چھوڑ کر انہیں آفسٹ کی چھپائی اختیار کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے، لیکن آفسٹ کی چھپائی گراں ہوتی ہے، جس کے ادبی رسالوں کے قارئین متحمل نہیں ہوسکتے، ان کی تعداد یوں ہی کم ہے، اس سے اس میں مزید کمی ہوگی۔

اس میں شبہ نہیں کہ گٹ اپ کی خوش نمائی اور کتابت و طباعت کی نفاست و لطافت کا اہتمام ضروری ہے، مگر قارئین کی قوتِ خرید کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے، زندگی کے تمام شعبوں کی طرح فنِ کتابت کا معیار بھی بہت پست ہوا ہے، یہ اگر پہلے کی طرح بہتر ہوجائے تو رسالے کا صوری معیار بہتر ہوجائے گا اور وہ قارئین کے لیے بھی پرکشش ہوجائے گا، اب آفسٹ کا رواج بڑھ رہا ہے، اس سے مفر نہیں اردو رسائل کو اس طریقۂ طباعت پر توجہ دینی ہی پڑے گی۔

۴۔ ادبی رسالوں اور قارئین کے رابطہ کی کمی کی شکایت بھی کی جاتی ہے، خط و کتابت سے رابطہ میں قوت و استحکام پیدا ہوتا ہے لیکن اردو رسالے قارئین کے خطوط کا جواب نہیں دیتے۔ ان کے مشوروں اور تجویزوں پر کوئی توجہ نہیں دیتے، اگر ان کی فروگزاشتوں سے

آگاہ کیا جاتا ہے تو اس کا برا مانتے ہیں، یہ ساری باتیں قارئین کو رسالے سے دور اور بے زار کر دیتی ہیں۔

(۱۱)

رسالوں کی جن داخلی خرابیوں کی نشاندہی کی گئی ہے ان میں سے اکثر آسانی سے جلد ہی دور کی جاسکتی ہیں اور بعض کو دور کرنے میں وقت لگ سکتا ہے مگر قارئین کی تعداد میں اضافہ کے لیے ان سب کی اصلاح ناگزیر ہے۔ رہے قارئین کے مسائل اور دشواریاں تو وہ بھی ناقابلِ اصلاح نہیں ہے، ہر ریاست کی اردو اکیڈمیوں کی توجہ اور دلچسپی سے بھی بعض مشکلات دور ہوسکتی ہیں، لیکن ان کا اصلی حل اردو کے فروغ اور اس کی تعلیم کے اچھے اور بہتر انتظام پر موقوف ہے، خصوصاً ابتدائی تعلیم کا مسئلہ ریڑھ کی ہڈی کی طرح بڑی اہمیت کا حامل ہے، اتر پردیش اور بعض دوسری ریاستی اکیڈمیوں نے کتابت اسکول کھولے ہیں۔ یہ بھی ضروری اور مفید کام ہوا ہے، لیکن اس سے زیادہ مقدم اور ضروری یہ ہے کہ جن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے، وہ اپنے بچوں کو لازماً اردو پڑھائیں، ابتدائی تعلیم اور تعلیمِ بالغاں کے لیے صباحی و شبینہ مکاتب قائم کیے جائیں۔ اردو قارئین کے بیشتر مسائل خود ہم اپنی جد و جہد سے حل کر سکتے ہیں اور جن کا تعلق حکومت سے ہے ان کے لیے ہمیں اپنی کوشش تیز تر کرنی ہوگی۔

یہ اطمینان اور خوشی کی بات ہے کہ دانش گاہوں میں اردو کی شرح خواندگی بڑھی ہے، لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ اصل چیز معیار کو بلند کرنا ہے جو روز بروز فروتر ہوتا جاتا ہے۔ اردو والوں کو اسے بہتر بنانے کے لیے بڑی کد و کاوش کرنی ہوگی، اگر اردو کا باقاعدہ رواج اور اس کی تعلیم کا معقول انتظام ہوجائے تو اردو کے ادبی رسائل و جرائد کے قارئین میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔

اخبار علمیہ

گاندھی جی کی پیدائش کو اب ایک سو انتیس سال ہو رہے ہیں، ان کی زندگی اور فلسفہ ونظریات کے متعلق بے شمار کتابیں شایع ہوتی رہی ہیں، حال ہی میں ایک جواں سال برطانوی مصنف پیٹرک فرنچ کی کتاب 'لبرٹی آر ڈیتھ' انڈیاز جرنی ٹو انڈیپنڈنس اینڈ ڈویژن' اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی ہے، اس کتاب پر مصنف کو سنڈے ٹائمز ایوارڈ برائے مصنف سال رواں سے بھی نوازا گیا، بعض ہندوستانی اخبارات نے اس کے اہم اقتباسات اور اس پر اپنے تبصرے بطور خاص پیش کیے، اس توجہ اور اعتنا کی شاید ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں گاندھی جی اور محمد علی جناح کے موازنہ میں بعض تعبیرات نئی ہیں، مثلاً یہ کہ نازک موقعوں پر گاندھی کے عمل میں قول و فعل کا تضاد تو نمایاں ہی ہے بظاہر وہ زیرک و متوازن فقیر منش شخص تھے لیکن درحقیقت وہ جذباتی اضطراب میں مبتلا سماجی کارکن اور سنگ دل اور دھار دار سیاسی ثالث تھے، مصنف نے دلیل میں ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے وزیر مواصلات ڈاکٹر جان متھائی کا یہ جملہ بھی نقل کیا ہے کہ "مسلم لیگ سے اطمینان بخش سمجھوتہ کی ناکامی میں سارا دخل کانگریسی قیادت کی گجراتی ذہنیت" کا تھا جو لین دین اور مول بھاؤ میں بے جا شدت کے مترادف ہے۔ دوسری جانب مصنف کا رویہ جناح کے متعلق خاصا نرم ہے، اس کے نزدیک جناح ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کی داستان کا فراموش شدہ کردار ہیں، حالانکہ ان کے سیاسی خیالات پچاس برس میں بتدریج مستحکم اور

ارتقا پذیر ہوتے رہے اور آخر میں تو وہ مطلق سیکولر ہو گئے تھے۔ مصنف اس خیال کا موید ہے کہ تقسیم ہند کے سخت موقف پر جناح کی ضد کی اصل وجہ کانگریسی قیادت اور اس کا سخت رویہ ہے، جناح اور گاندھی کی نسبت ہم وطنی کے حوالہ سے لکھا گیا کہ گجراتی الاصل ہونے کی وحدت بھی ان دونوں کو متحد نہ کر سکی، ایک جگہ لکھا گیا کہ صداقت کے جویا و پرستار ہونے کے باوجود گاندھی صداقت کے تعین میں پریشاں خاطر رہے، اسی لیے تحریک آزادی میں ان کی شخصیت سب سے زیادہ مبہم و متناقض رہی اور باوجودیکہ ان پر سب سے زیادہ اظہار خیال کیا گیا، ان کے افکار کو سمجھنا بڑا مشکل کام ہے، پیٹرک فرنچ کی تحقیق نے اسی پر اکتفا نہیں کیا یہ بھی لکھ دیا کہ کسی بھی خاص موضوع پر ان کے بیانات کا غائر مطالعہ کیا تو وضاحت و صراحت کے بجائے اختلال و بدحواسی کا عالم زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

ان دنوں یورپ میں بعض قدیم آثار فنون جمیلہ کے حق ملکیت کے لیے برٹش میوزیم اور برطانیہ کی چند نمایاں آرٹ گیلریوں اور یوکرین (روس) کے شہر ۱۷۵۷ کے ایک میوزیم کے درمیان عجیب قانونی تنازعہ موضوع بحث ہے، چند ماہ بعد واشنگٹن میں ایک اہم سیمینار 'نازی عہد اور گم شدہ سرمایہ فن' کے موضوع پر منعقد ہو رہا ہے، یہ تنازعہ اس میں بھی شد و مد سے پیش کیا جائے گا۔ برطانوی اخبار دی سنڈے ٹائمز نے گذشتہ ماہ یہ انکشاف کیا تھا کہ برطانیہ کے ان عجائب خانوں نے خاموشی کے ساتھ نازی آرٹ ٹاسک فورس' بھی قائم کر لی ہے جس کا مقصد ہی یہ ہے کہ ان نوادر کے متعلق فریق ثانی کے ہر دعویٰ اور استحقاق کو بین الاقوامی تنازعہ کی شکل اختیار کرنے سے قبل ہی باطل قرار دے، اس پورے قضیہ کا اصل سبب یہ ہے کہ ان تصویروں کا تعلق

ہٹلر سے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ان مرقعوں کا شیدائی تھا اور یہ شاہکار اس کے محل خاص کی دیواروں کی زینت تھے، ان میں ایک مرقع 'دی ریپ آف یوروپا' خاص طور پر قابل ذکر ہے جس کی نسبت فنون جمیلہ کے مشہور جرمن شیدائی D/RER (۱۴۷۱ء ۔ ۱۵۲۸ء) سے کی جاتی ہے، یہ وہی شخص ہے جس نے اطالیہ کی نشاۃ ثانیہ کے اولین شاہکاروں کو جرمنی منتقل کیا تھا، جرمنی میں اس کو بطل عظیم کی حیثیت حاصل ہے، وہ ہٹلر کا بھی ممدوح تھا، ہٹلر نے خود اس کا پورٹریٹ تیار کیا تھا، D/RER کے یہ نایاب فن پارے پولینڈ کے اشراف نے ۱۸۲۳ء میں Lvov کے ایک میوزیم کے حوالے کر دیے تھے بعد میں یہ شہر یوکرین روس کے زیر انتظام آگیا اور جب دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کی فوج ظفر موج نے اس شہر پر قبضہ کیا تو نازی فوج نے اموال غنیمت کی لوٹ میں سب سے پہلے اسی خزانہ نادرہ کا رخ کیا اور میوزیم کے مہتمم کو سخت اذیتیں دینے کے بعد بالآخر D/RER کی چونتیس تصاویر حاصل کر لیں اور یہ برلن میں ہٹلر کے سپرد کر دی گئیں، جو ان کا اس درجہ شیدائی تھا کہ محاذ جنگ پر جہاں جاتا حفاظت کے خیال سے ان مرقعوں کو اپنے ساتھ رکھتا، اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس طرح میں مسلسل ان کی دید سے لطف اندوز ہوتا ہوں، ہٹلر کا خاتمہ ہوا تو نازی فوجوں نے ان تصویروں کو آسٹریا کی نمک کی کانوں میں چھپا دیا، لیکن امریکی فوجوں نے ان کو وہاں سے برآمد کرنے کے بعد بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے Lvov کے میوزیم کو واپس کرنے کے بجائے ایک قدرداں کے ہاتھوں خطیر رقم کے عوض فروخت کر دیا۔ بعد میں یہ اور گراں ہو کر خرید و فروخت کے عمل سے گزر کر برطانوی متاحف کی زینت بن گئیں D/RER کے ان شاہکاروں کے علاوہ تقریباً ایک لاکھ سے زیادہ فن مصوری

کے نوادر کے متعلق اخبار آرٹ میں سرقہ شدہ نوادر کے ایک ماہر مارٹن بیلی کا مضمون چھپا ہے کہ یہ نازیوں کی لوٹ کا شکار ہو کر اب مفقود الخبر ہیں، ان کی قیمت کا اندازہ ۱۰ ملین پاؤنڈ لگایا جاتا ہے، خیال ہے کہ یہ سرمایہ عوامی خزینوں میں موجود ہے، لیکن یہ ظن و تخمین کے غبار میں اوجھل ہے، Lvov اور برطانیہ کے متاحف کے قضیہ کا فیصلہ خواہ کچھ ہو لیکن اس داستان میں یورپ کے بعض فاتحوں اور حوصلہ آزماؤں کی تمناؤں کے کچھ دلچسپ پہلو ضرور سامنے آگئے ہیں۔

یورپ کے متاحف اور میوزیموں کی اہمیت خواہ کچھ بھی ہو لیکن ہندوستان میں اس پر خاطر خواہ توجہ کا فقدان ہے، دہلی کا نیشنل میوزیم اس کی مثال ہے، حالانکہ اس میں نوادر و عجائبات کی کمی نہیں، اس کے دالانوں، کمروں اور راہداریوں میں ایسے نوادر کثرت سے ہیں جو دامن دل کو قدم قدم پر اپنی جانب کھینچتے ہیں لیکن افسوس اور حسرت اس پر ہے کہ ان کے متعلق مفصل معلومات دستیاب ہیں نہ ان کی نمائش میں کوئی سلیقہ نظر آتا ہے، کسی سے دریافت کرنا چاہیں تو بس مایوسی ہاتھ آتی ہے، اگر کچھ بتایا بھی جاتا ہے تو یہ سطحی معلومات سے زیادہ نہیں، عجائب گھر کی اشیاء کے متعلق مفصل کتابوں کا ذکر کیا کتابچے بھی دستیاب نہیں؛ مغرب میں یہ عجائب خانے آمدنی میں اضافہ کا بڑا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں، مصور کارڈوں، پوسٹروں اور میوزیم کی بعض شاندار چیزوں کی تصاویر کے علاوہ بیگ، ٹی شرٹ، چابی کے چھلے وغیرہ خاص ذرائع آمدنی ہیں؛ دہلی کے نیشنل میوزیم میں اگر کچھ تصویریں فروخت بھی کی جاتی ہیں تو بقول ٹائمز آف انڈیا

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ کتنی مدت پہلے چھپی تھیں، اس ناقص کارکردگی کا بڑا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ یہ میوزیم عرصہ سے کسی باقاعدہ سربراہ سے محروم ہے ٹائمز آف انڈیا نے بڑی تلخی سے چند سوالات کیے ہیں کہ آخر بیشتر ہندوستانیوں کے لیے یہ عجائب خانے خشک، غیر دلچسپ اور اکتا دینے والے کیوں ہوتے ہیں، برٹش میوزیم تو ہفتہ بھر کھلا رہتا ہے اور لاکھوں سیاحوں کی ضیافت طبع و نظر کا سامان فراہم کرتا ہے، ان سوالوں کا جواب بھی اس نے خود ہی یہ کہہ کر فراہم کر دیا کہ کسی ادارہ کی فعالیت و کارکردگی اس کے سربراہ پر منحصر ہے اور یہاں یہی بنیادی نقطہ ہی مفقود ہے۔

کتابوں کی دنیا کی ایک خبر یہ بھی ہے کہ گزشتہ دنوں لندن کے ایک نیلام گھر میں جیفری چاسر کی مشہور کتاب CANTERBURY TALES کے پہلے ایڈیشن کا ایک نادر نسخہ ۳۵ء۷ ملین ڈالر میں فروخت ہوا، یہ کتاب ۱۴۷۶ یا ۱۴۷۷ء میں انگلینڈ میں چھپی تھی اور اس کے ناشر ولیم کیکسٹن تھے، کتاب کی جلد سرخ چمڑے کی تھی، تقریب ساڑھے سات ملین ڈالر کی یہ خطیر رقم دنیا میں کسی بھی کتاب کی سب سے زیادہ قیمت ہے، اس سے پہلے ۱۹۸۷ء میں ۱۴۵۵ء کی مطبوعہ بائبل کا ایک نسخہ ۳ء۵ ملین ڈالر میں فروخت ہوا تھا۔ چاسر کی کتاب اس سے بھی قیمتی ثابت ہوئی۔

ع۔ ص۔

وفیات

مولانا صدرالدین اصلاحی

افسوس ہے کہ ۱۳ نومبر ۹۸ء کو ہندو پاک کے مشہور عالم و مصنف، جماعت اسلامی کے ممتاز رہنما اور مدرستہ الاصلاح کے مایہ ناز فرزند مولانا صدرالدین اصلاحی انتقال فرماگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ عرصہ سے بیمار اور موتوا قبل ان تموتوا کی تفسیر بن گئے تھے۔

ان کی ولادت ۱۹۱۶ء میں ہوئی، ان کا تعلق اعظم گڈھ کے ایک گاؤں سیدھا سلطان پور سے تھا، جہاں افغانستان کے زئی قبیلہ کے پٹھان آباد ہیں، مولانا محمد شفیع بانیِ مدرستہ الاصلاح کا تعلق بھی اسی خاندان اور گاؤں سے تھا۔

علامہ شبلیؒ کے وطن بندول میں ان کی نانہال تھی۔ یہیں رہ کر انہوں نے بلریا گنج سے مڈل پاس کیا، پھر عربی تعلیم کے حصول کے لئے مدرستہ الاصلاح میں داخل ہوئے، طالب علمی کے زمانے میں وہ اور ان کے ایک دوست مولانا محمد عاصم اصلاحی جو ان سے ایک درجہ آگے تھے، اپنی ذہانت و صلاحیت کی وجہ سے پورے مدرسہ میں ممتاز تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اول الذکر پٹھان کوٹ اور موخر الذکر دارالعلوم دیوبند چلے گئے مگر ان کی آمد و رفت ایک دوسرے کے یہاں ہوتی رہتی تھی، بعد میں ان کی راہیں مختلف ہوگئی تھیں، اسی لئے جب ملتے تو خوب طنز و تعریض اور فقرے بازی ہوتی۔ طالب علمی میں یہ دونوں حضرات اپنے استاذ مولانا نجم الدین اصلاحی کے بڑے چہیتے تھے، انہوں نے اپنی کتاب "یادگار سلف" میں دونوں کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے، مولانا صدرالدین صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

"ان میں سے ایک عزیز محترم مولوی صدرالدین اصلاحی سلمہٗ کی ذات ہے جو اپنی خداداد ذہانت اور فطری صلاحیت کے اعتبار سے (چشم بد دور) آپ اپنی نظیر ہیں اور جن کی عزت و محبت میرے دل کی گہرائیوں میں ہے اور آیندہ زندگی میں عزیز موصوف سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں، عزیز کے متعلق بعض اکابر نے ابتداہی میں مضامین وغیرہ دیکھ کر خوش آیند مستقبل کی بشارت دی تھی، چنانچہ جب ۱۹۳۷ء میں مدرسہ سے فارغ ہوچکے تو متکلم اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ مدیر ترجمان القرآن کی جوہر شناس نظر نے دارالاسلام پٹھان کوٹ پنجاب بلالیا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ علم و عمل اور زندگی کے پاک مقاصد میں کامیاب فرماکر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلامی کے لئے باعث فخر بنائے" (ص ۸)

آخری درجہ کے سالانہ امتحان میں حجۃ اللہ البالغہ کا پرچہ علامہ سید سلیمان ندوی نے بنایا تھا، وہ مولانا صدرالدین صاحب کے جوابات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی کاپی پر "لایق تربیت" تحریر فرمایا۔

انھوں نے مولانا نجم الدین اصلاحی کے علاوہ مولانا شبلی متکلم ندوی، مولانا حکیم محمد احمد لہزاوی، مولانا محمد سعید ندوی، مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا اختر احسن اصلاحی وغیرہ سے بھی درس لیا۔

طالب علمی کے زمانے ہی سے ان کے مضامین ترجمان القرآن اور دوسرے رسالوں میں چھپنے لگے تھے، یہی ان کے پٹھان کوٹ جانے کی تقریب بنے، وہاں انھوں نے تفسیر، حدیث اور فقہ کی امہات کتب اور علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ صاحب کی تصنیفات کا مطالعہ بڑی محنت و جاں فشانی سے کیا اور ترجمان القرآن کے لئے بڑے معرکۃ الآرا مضامین لکھے جو بعد میں کتابی صورت میں طبع ہوئے، یہاں ان کے قیام کے زمانے میں جماعت اسلامی کی تاسیس ہوئی اور وہ اسی وقت اس کے رکن ہوئے اور تا عمر پوری استقامت کے ساتھ اس سے وابستہ رہے۔

پٹھان کوٹ کی آب و ہوا راس نہ آنے کی وجہ سے وہ رنگون (برما) تشریف لے گئے، ۱۹۴۶ء میں مدرسۃ الاصلاح میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے، ۱۹۴۹ء میں امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث صاحب نے ان کو رام پور بلالیا، وہاں جانے سے قبل راقم نے سورۂ حدید تا حشر کا ترجمہ اور کلیلہ دمنہ کے بعض ابواب ان سے پڑھے، رام پور میں تعلیمی و انتظامی کاموں کے ساتھ ہی تصنیف و تالیف کا کام بھی ان کے سپرد ہوا، پھر علی گڈھ میں جماعت کے زیر اہتمام ادارہ تصنیف و تالیف قائم ہوا تو اس کی صدارت انہیں تفویض کی گئی، اس عرصہ میں خود تصنیف و تالیف کے علاوہ بعض طلبہ کو اس کی تربیت دی اور ایک علمی و تحقیقی سہ ماہی رسالہ "تحقیقاتِ اسلامی" جاری کیا۔ لیکن صحت کی خرابی سے یہاں کا قیام ترک کر کے اعظم گڈھ کے قصبہ پھول پور میں قیام پذیر ہوگئے جہاں ان کے صاحب زادے ڈاکٹر افتخار احمد پریکٹس کرتے تھے، بالآخر یہیں خاتمہ بالخیر ہوا۔

قرآن مجید پر ان کی اچھی اور گہری نظر تھی، وہ گفتگو بھی کرتے تھے تو اکثر موقع و محل کے مناسب آیتیں پڑھتے جاتے، انہیں ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی سے براہ راست استفادہ کا موقع نہیں ملا لیکن بالواسطہ ان پر "فکر حمید" ہی کی چھاپ تھی۔ تصنیف و تالیف کا خداداد اور فطری ملکہ تھا، ان کی تصنیفات کے نام یہ ہیں۔

معرکۂ اسلام و جاہلیت، فریضہ اقامت دین، اساس دین کی تعمیر، قرآن مجید کا تعارف، دین کا قرآنی تصور، اسلام ایک نظر میں، اسلام اور اجتماعیت، مسلمان اور امامت کبریٰ، تحریک اسلامی ہند،

حقیقت نفاق، حقیقت عبودیت، اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ، راہ حق کے مہلک خطرے، نکاح کے اسلامی قوانین، یکساں سول کوڈ اور مسلمان، اسلامی نظام معیشت، دین کا مطالعہ، مسلم پرسنل لا دینی و ملی نقطہ نگاہ سے، مسلمان اور دعوت اسلام، تلخیص تفہیم القرآن۔

یہ کتابیں جماعت کے علاوہ دوسرے حلقوں میں بھی پسند کی گئیں اور متعدد کے ترجمے ہندی اور دوسری ملکی زبانوں میں ہوئے، غیر مسلموں کو اسلام سے روشناس کرانے میں جماعت اسلامی کو علانیہ ترجیح حاصل ہے، اس نے اپنے ضروری اور اہم لٹریچر کے ترجمے کے علاوہ ہندی اور ملک کی مختلف زبانوں میں طبع زاد کتابیں بھی شائع کی ہیں، شروع میں ہندی میں قرآن مجید کے ترجمہ کا پروگرام بنا تو مولانا صدرالدین صاحب نے اردو میں تیسیر القرآن لکھنے کا آغاز کیا جس کے کچھ حصے ان کے استاذ مولانا اختر احسن اصلاحی کے ملاحظے کے بعد ماہنامہ "زندگی" میں شائع ہوئے مگر پھر یہ سلسلہ موقوف ہو گیا اور اس کا ہندی ترجمہ بھی نہیں چھپا۔

مولانا صدرالدین صاحب کو مدرسۃ الاصلاح اور جامعۃ الفلاح سے خاص تعلق تھا، وہ ان کی انتظامی و تعلیمی مجالس کے رکن اور موخر الذکر کے ناظم بھی تھے، ان اداروں کو ان کے تجربہ، دور اندیشی، اصابت رائے اور تدبر سے بڑا فائدہ پہنچا، آخر میں جلسوں میں شرکت سے معذوری کے باوجود ان کے حالات سے باخبر اور ان کے لئے فکر مند رہتے، ان کی وفات سے یہ ادارے اپنے ایک بڑے سرپرست سے محروم ہوگئے، ان کی وفات جماعت اسلامی کا بھی ناقابلِ تلافی خسارہ ہے، اب جماعت میں اس پایہ کا مدبر، صاحب فراست اور ذی بصیرت عالم نظر نہیں آتا۔

مولانا تدبر و تفکر کے عادی، خاموش، سنجیدہ اور باوقار شخص تھے، جلوس، سطحی، ہنگامی اور عام دلچسپی کے کاموں سے ان کو کوئی مناسبت نہ تھی، سستی شہرت اور نام و نمود سے بیزار تھے، ان کے تعلقات بھی زیادہ وسیع نہ تھے، عام تو درکنار خاص لوگوں سے بھی زیادہ اختلاط پسند نہ کرتے کیونکہ علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یہی چیزیں بڑی تباہ کن ہوتی ہیں، وہ خاموشی سے علم و دین کی خدمت کو اپنا مقصدِ حیات بنائے ہوئے تھے، تاہم متقشف اور خشک آدمی نہ تھے، اپنے ہم مذاق دوستوں سے بڑی بے تکلفی سے ملتے اور نہایت دلچسپ اور پر لطف باتیں کرتے، ایسے موقعوں پر ان کی ذہانت و ظرافتِ طبع کے خوب نمونے دیکھنے میں آتے۔

اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس خادم کی مغفرت فرمائے، ان کے اعزہ اور اہل تعلق کو صبر جمیل عطا کرے آمین۔

"ض"

پروفیسر محمد اسلم مرحوم

یہاں بڑی تاخیر سے یہ افسوس ناک خبر ملی کہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے سابق استاد پروفیسر محمد اسلم ۶/ اکتوبر کو اچانک حرکتِ قلب بند ہوجانے سے اس دنیا سے رخصت ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون

ان کا خاص موضوع تاریخ ہند تھا، عہد سلطنت و دور مغلیہ کے حکمرانوں اور اس عہد کے مشائخ کے متعلق ان کے مقالات اور کتابوں کو علمی و تحقیقی حلقوں میں قدر و ستایش سے دیکھا گیا اور ان کی بڑی پذیرائی بھی ہوئی۔

طالب علمی کے زمانہ سے ہی تاریخ سے ان کو خاص لگاؤ رہا، پنجاب یونیورسٹی سے اسی مضمون میں انہوں نے ایم۔ اے کیا، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے علاوہ انہوں نے برطانیہ میں ڈرہم، مانچسٹر اور کیمبرج یونیورسٹیوں سے بھی اکتساب علم کیا۔ لاہور میں ڈاکٹریٹ کے لئے انہوں نے شاہجہاں کی مذہبی پالیسی کا عنوان منتخب کیا تھا، لیکن اس کی تکمیل سے پہلے ان کو یورپ جانے کا موقع ملا جس کی وجہ سے غالباً یہ مقالہ مکمل نہ ہوسکا۔

ان کی تحریری صلاحیتوں سے متاثر ہوکر شیخ محمد اکرام نے ان کو تحقیقی مضامین لکھنے پر آمادہ کیا، ۱۹۶۰ء سے یہ سلسلہ شروع ہوا تو برصغیر کے اکثر ممتاز رسائل و مجلات میں ان کی تحریریں شائع ہوتی رہیں، خاص طور پر رسالہ برہان دہلی کے صفحات پر ان کی نگارشات کثرت سے نظر آتی ہیں جن میں مقالات، تنقید و تقریظ اور تعزیتی مضامین وغیرہ شامل ہیں۔ **معارف** میں بھی ان کے کئی مضامین چھپے، دین الٰہی اور اس کا پس منظر، شاہان مغلیہ کا ذوق موسیقی، مسلمانوں کی جغرافیائی خدمات، فتوحات فیروزشاہی، مسجد قبا سے تاج محل تک، عربوں کے عہد میں سندھ میں علم و ادب، ہیر وارث شاہ کی تاریخی اہمیت، سلاطین دہلی، ہندو تہذیب اور ادب اور داراشکوہ کے مذہبی رجحانات وغیرہ مقالات سے ان کی وسعتِ مطالعہ، ذوق تحقیق، دقتِ نظر اور تبحرِ علمی کا اندازہ ہوتا ہے، دین الٰہی اور اس کا پس منظر جب کتابی شکل میں شائع ہوئی تو ان کے استاد اور تاریخ کے مشہور معلم پروفیسر شیخ عبدالرشید نے لکھا کہ اس موضوع پر اس سے زیادہ مستند کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ یہ کلمات محض حوصلہ افزائی کے لئے نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہیں، اس کتاب کی تالیف میں ایسے

مخطوطات سے بھی استفادہ کیا گیا تھا جو محققین کی نظروں سے اب تک پوشیدہ تھے۔

تذکرۂ مشائخ اور مطالعۂ ملفوظات میں انہوں نے پروفیسر خلیق احمد نظامی کا تتبع کیا اور دور نظامی، حضرت مجدد الف ثانی اور جہانگیر، ملفوظاتِ خواجہ بندہ نواز گیسودراز، خواجہ محمد ہاشم کشمی، داتا گنج بخش کی لاہور میں آمد جیسے وقیع، بلند پایہ اور پر از معلومات مقالات سپرد قلم کئے، ان مضامین کے مجموعے انہوں نے لاہور میں اپنے قائم کردہ ادارہ ندوۃ المصنفین سے "تاریخی مقالات" اور "سرمایۂ عمر" کے نام سے شائع کئے، ان کی دیگر تصنیفات میں شیخ احمد سرہندی، شاہ فتح اللہ شیرازی، تاریخ پاک و ہند، تاریخ پاکستان اور دنیائے اسلام بھی شامل ہیں، ان کے علاوہ فضل اللہ روزبہان اصفہانی کی سلوک الملوک کا انہوں نے مسلم کنڈکٹ آف اسٹیٹ کے نام سے انگریزی میں ترجمہ بھی کیا، ان کی ایک اور اہم کتاب وفیاتِ مشاہیر پاکستان کو مقتدرہ قومی زبان پاکستان نے ۱۹۹۰ء میں اہتمام سے شائع کیا، یہ ۱۴ اگست ۴۷ء سے ۱۴ اگست ۸۷ء تک وفات پانے والے مشاہیر کا مفصل اشاریہ ہے، یہ کتاب اصلاً وفیات نگاری و آثار شناسی کی اس روایت کی تجدید ہے، جس کی ابتدا اردو میں آثار الصنادید کے ذریعہ سر سید احمد خاں نے کی تھی، پروفیسر محمد اسلم مرحوم کے ذوق تاریخ نے آثار شناسی میں اپنی نوعیت کی پہلی اور انوکھی تحقیقی کاوش کی جانب ان کو متوجہ کیا، چنانچہ انہوں نے مشاہیر کے مزاروں کے الواح و کتبات کی نقل حاصل کرنے کا اہتمام کیا اور جب الواح الصنادید کے نام سے ان کی یہ کاوش برہان و معارف کے صفحات پر منتقل ہوئی تو قدر دانوں کے لئے یہ دلچسپی اور افادیت کا سامان ثابت ہوئی، اندازہ ہوتا ہے کہ الواح مزار سے ان کا یہ شغف شروع سے تھا، کیوں کہ ۱۹۶۸ء میں جب وہ برہان پور میں شیخ محمد ہاشم کشمی کے مزار پر گئے تھے تو اس وقت بھی لوح مزار کی عبارت نقل کرلی تھی، الواح الصنادید کے حصول کے شوق کے نتیجہ میں خفتگانِ خاک لاہور اور خفتگانِ کراچی جیسی کتابیں تیار ہوئیں، جو اب جدید فن رجال و تذکرہ اعلام میں مستند مرجع و ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان کی تمام تحریروں میں سب سے نمایاں خوبی تلاش و تحقیق میں سخت محنت اور اصل مصادر تک رسائی ہے، اس راہ میں انہوں نے یورپ اور برصغیر کے اکثر کتب خانوں سے براہ راست استفادہ کیا، ہندوستان وہ کئی بار آئے ۱۹۶۷ء میں علی گڈھ آئے تو صاحبِ برہان مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم کی صاحبزادی سے عقد ہوا، ان کا تعلق پنجاب کے ایک معزز خاندان سے تھا، اپنے جد امجد حاجی عمر الدین آف پھلور کے لئے انہوں نے اپنا مجموعۂ مضامین سرمایہ عمر کے نام سے نذر کیا، ان کے والد چودھری طفیل محمد بھی نیک نام و شریف بزرگ تھے، خود بھی خاکِ پنجاب کے طبعی حسن و صحت کا نمونہ تھے، ظاہر کے مانند باطن بھی محاسن سے آراستہ تھا، سادہ دل اور تکلفات سے عاری تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے کہ "ہم لوگ پنجاب کے رہنے والے ہیں اس لئے تکلفات میں نہیں پڑتے" پنجاب یونیورسٹی سے وظیفہ یابی کے بعد سر سید سوسائٹی سے وابستہ

ہوگئے تھے اور اس کے ترجمان رسالہ تہذیب الاخلاق لاہور کے مدیر بھی ہو گئے تھے۔

دارالمصنفین سے تعلق رکھتے تھے، اپنی کتابیں معارف میں تبصرہ کے لئے ضرور بھجواتے، جناب شیخ نذیر حسین صاحب مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے خطوط سے ان کی خیریت مل جاتی تھی، مگر ادھر عرصہ سے ان کی کوئی خبر نہیں ملی تھی، ان کی اولاد میں فواد ظفر کا نام معلوم ہو سکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے تمام پس ماندگان کو صبر و رضا کی توفیق دے اور ان کی نیکیوں کو قبول فرماکر اعلیٰ مدارج سے سرفراز فرمائے۔

ع - ص

پروفیسر قیام الدین احمد صاحب مرحوم

پروفیسر قیام الدین احمد مرحوم ملک کے ممتاز مورخ اور مشہور عالم و محقق تھے، ۲۷/اگست ۱۹۹۸ء کو ان کا انتقال اچانک حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے ہوا، اس وقت وہ خدابخش لائبریری پٹنہ کے ایک سیمینار کے لیے اپنا مقالہ ٹائپ کر رہے تھے جو آزادی کی گولڈن جبلی تقریبات کے سلسلے میں جامعہ ہمدرد دہلی میں ہونے والا تھا۔

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ اور انیسویں صدی کا ہندو مسلم معاشرہ ان کا خاص موضوع تھا، اس پر ان کی نظر وسیع تھی۔ بہار میں ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ نویسی کی روایت کی بنیاد شاد عظیم آبادی اور ونایک پرشاد نے ڈالی تھی جس کو سر جدوناتھ سرکار نے پروان چڑھایا اور پدم شری پروفیسر سید حسن عسکری نے نقطۂ عروج تک پہونچایا، پروفیسر قیام الدین اسی سلسلہ کی آخری کڑی تھے، ان کی وفات سے جو خلا ہوا ہے اس کا پُر ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

ملک و قوم کی بے لوث خدمت اور آزادی وطن کی تحریک میں علمائے صادق پور کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں، مرحوم قیام الدین کا تعلق اسی عظیم اور مقدس خانوادے سے تھا، حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اصلاح و جہاد میں بھی اس خاندان کے بزرگوں نے بڑے جوش و خروش اور نہایت عزم و استقلال سے حصہ لیا تھا۔

مرحوم کے اجداد میں مولانا احمد اللہ صاحب اور کئی لوگوں کو انبالہ مقدمات کے سلسلہ میں کالے پانی کی سزا ہوئی۔ موجودہ صدی کے اوائل میں اس خاندان کے افراد کا رجحان مغربی تعلیم کی طرف ہوگیا۔ پروفیسر قیام الدین احمد صاحب کے دادا ڈاکٹر عظیم الدین احمد عربی کے مشہور فاضل اور اردو کے معروف شاعر و نقاد تھے، انہوں نے سر محمد اقبال کے ساتھ جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی اور پٹنہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو و فارسی و عربی کے صدر رہے، مرحوم قیام الدین صاحب کے والد جناب حلیم الدین احمد پٹنہ کالج میں تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے، ان کے عم محترم پدم شری کلیم الدین احمد جو عالمگیر شہرت کے حامل تھے، پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی ادبیات کے استاد اور اردو کے ماہر فن نقاد کی حیثیت سے غیر معمولی شہرت حاصل کی، پروفیسر قیام الدین اسی عظیم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

پروفیسر قیام الدین احمد کی ولادت ۱۹۳۰ء میں خواجہ کلاں پٹنہ سٹی میں ہوئی تھی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم محمڈن اینگلو عربک اسکول میں حاصل کی جس کو ان ہی کے اجداد نے سر سید احمد کی تحریک سے متاثر ہوکر ۱۸۸۴ء میں قائم کیا تھا۔ اسی اسکول میں مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمن نے بھی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ اپنی وفات کے وقت قیام الدین احمد صاحب اس اسکول کی انتظامیہ کے سکریٹری بھی تھے۔

۱۹۵۰ء میں انہوں نے تاریخ میں ایم۔ اے کیا اور ۱۹۵۲ء میں بہار ایجوکیشن سروس سے وابستہ ہوئے اور کاشی پرشاد جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ایک ریسرچ فیلو کی حیثیت سے اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا۔ اس ابتدائی دور میں وہ مشہور مورخ کے۔ کے دتا کے ساتھ دو اہم کتابوں کی ترتیب و تدوین میں ان کے معاون رہے (بایوگرافی آف کنور سنگھ اینڈ امر سنگھ اینڈ بہار تھرو دی ایجیز)

انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع سید احمد شہیدؒ کی تحریک کو بنایا جسے بدنام کرنے کے لیے وہابی تحریک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس پر ۱۹۹۲ء میں انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری سے نوازا گیا اسی زمانہ سے مرحوم سید حسن عسکری، اے۔ ایس۔ آلٹیکر، فصیح الدین بلخی اور پروفیسر رام شرن شرما جیسے مشہور عالموں سے ان کی قربت بڑھی اور انہوں نے ان سے بڑا استفادہ کیا۔ ۱۹۹۷ء میں اپنے استاد رام شرن شرما کے اصرار سے جو ابھی باحیات ہیں، پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے وابستہ ہوگئے اور علمی و تحقیقی کاوشوں میں مرتے دم تک مشغول رہے ۱۹۹۲ء میں تدریسی کاموں سے سبکدوش ہوگئے۔ ادھر کچھ عرصہ سے وہ اور پروفیسر سریندر گوپال صاحب پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے اصرار پر دوبارہ ہفتہ میں دوبار تدریس کا کام انجام دینے لگے تھے۔

قیام الدین صاحب کو تحریر و تصنیف کا اچھا سلیقہ تھا، انہوں نے ایک درجن سے زیادہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں بعض کو انہوں نے ایڈٹ کیا ہے اور بعض ترجمے ہیں۔ ان کے مضامین کی تعداد ۱۵۰ سے متجاوز ہوگی جو زیادہ تر انگریزی زبان میں ہیں۔ ان کے اردو مقالے اور مضامین پٹنہ کے مشہور رسالہ 'معاصر' میں طبع ہوئے ہیں۔ یہ مقالے وہابی تحریک، ہندو مسلم معاشرہ، بہار کی علاقائی تاریخ، عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ و ثقافت، تحریک آزادی، تاریخی دستاویز، قلمی نسخے، شخصیات اور دیگر موضوعات سے متعلق ہیں، ان کی تلاش و جستجو سے بہار کی کتنی نایاب اور مفقود کتابیں منظر عام پر آئیں۔ دربھنگہ اور تمبیا راج کے قیام کے متعلق اہم ترین دستاویز اور فرامین بھی شایع کیے۔ چند ماہ قبل انہوں نے نالندہ ضلع میں بلسا کے قریب واقع اساڑھی میں سولھویں صدی کے بادشاہ اکبر کے ایک ہمعصر صوفی بزرگ شاہ سلطان کے مزار کو دریافت کیا تھا۔ اسی کے قریب واقع تلہاڑہ

میں انہوں نے ایک سنگی مسجد کی تاریخی حیثیت کو نمایاں کیا اس انکشاف کے بارے میں راقم کو پچھلی ملاقات میں تفصیل سے بتایا تھا۔ یہ مسجد بہار کی قدیم ترین مسجد ہے۔ اس کی تعمیر بختیار خلجی کی آمد کے زمانے میں ہوئی تھی۔

ان کی اہم ترین کتاب "وہابی موومنٹ آف انڈیا" ہے۔ دوسری اہم کتاب کارپس آف عربک اینڈ پرشین انسکرپشن آف بہار ہے۔ دیگر کتابوں میں قومی تحریک کے اہم قائد بیرسٹر مظہر الحق کی سوانح عمری انہوں نے لکھی۔ البیرونی کی شہرۂ آفاق تصنیف کتاب الہند کو ایڈٹ کیا، چند اہم تواریخ کی کتابوں کا انہوں نے اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ مثلاً سید نور الحسن کی کتاب "سم تھاٹس آف ایگریرین ریلیشن ان مغل انڈیا" اور پروفیسر محمد حبیب و خلیق احمد نظامی کی ایڈٹ کی ہوئی معروف کتاب "دی دلی سلطنت"۔

آل انڈیا ریڈیو سے انگریزی، ہندی اور اردو میں ان کی تقریریں اور مقالے برابر نشر ہوتے رہتے تھے۔ دوردرشن (رانچی) کے چوپال پروگرام میں قومی یکجہتی کے موضوع پر انہوں نے اپنے خیالات ظاہر کیے۔ ایس۔ کے۔ سنہا (موجودہ گورنر آسام) کے ساتھ انہوں نے پاٹلی پتر سے پٹنہ تک دستاویزی فلم بنائی جو ۱۹۹۷ء کے پاٹلی پتر مہوتسو میں دکھائی گئی۔ وہابی تحریک پر بھی ایک دستاویزی فلم بنائی جو عنقریب پیش ہونے والی ہے۔

پروفیسر قیام الدین مختلف مذاکروں، سیمناروں اور علمی مباحثوں میں بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ مئی ۱۹۸۵ء میں وہ اسلام اور عیسائیت کے مابین بین الاقوامی مکالمہ میں بھی شامل ہوئے تھے اور اس موقع پر روم میں انہوں نے پوپ جان دوم سے بھی ملاقات کی تھی۔

پروفیسر قیام الدین مختلف سرکاری، نیم سرکاری اداروں، انجمنوں اور اکیڈمیوں کے رکن تھے، بعض کے سکریٹری اور سرپرست بھی تھے، ان میں ساہتیہ اکیڈمی (نئی دلی) پبلیکیشن ڈیویژن (بھارت سرکار) بیورو فار انفارمیشن آف اردو (بھارت سرکار) N.C.E.R.T (این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی نئی دلی) انڈین ہسٹوریکل ریویو، انڈین کونسل آف ہسٹوریکل ریسرچ، بہار اتہاس پریشد، خدا بخش لائبریری شامل ہیں، وہ چند صوبائی پبلک سروس کمیشنوں کے رکن بھی تھے۔

راقم کو ایسے قابل ولایق دانشور سے تلمذ کا شرف حاصل ہے جس پر اس کو ہمیشہ ناز رہے گا، ان کو ۱۹۷۲۔۷۳ سے بہت قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا، انکی عظیم عالمانہ اور محققانہ شخصیت ان کے چہرے سے ہی عیاں ہوتی تھی، وہ نہایت ہی کم سخن لیکن اصول وضابطے کے بڑے پابند تھے۔ جب میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو دوسرے شعبوں کے طلبا بھی اکثر ان کے لکچر سننے کے لیے آیا کرتے تھے۔ وقت کے نہایت ہی پابند تھے۔ میں جب بھی ان سے ملنے جاتا اس بات کا خاص لحاظ رکھتا تھا۔ علمی مباحثوں اور جلسوں میں ان کا انداز بیان ہمیشہ پر لطف اور رتین ہوتا تھا، وہ کوزے میں سمندر کو سمو دیتے تھے۔ ہمارے استاذ محترم پروفیسر سمنت نیوگی موجودہ صدر شعبہ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی ایسے موقع پر اکثر کہا کرتے تھے کہ "اوہ مائی گاڈ ہی از سمپلی ایکسلینٹ"۔ بہت سے انگریز پروفیسر بھی ان کی اس خصوصیت کی تعریف کرتے تھے میں نے انہیں کی نگرانی میں اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مکمل کی، اسکے موضوع "اردو تاریخ نویسی" پر کافی خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ افسوس اور سخت افسوس ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) اور ان سے بہت کچھ حاصل کرنے کی تمنا دل ہی میں رہ گئی۔

ج۔ ع۔

مطبوعات جدیدہ

تاریخ علوم اسلامیہ

(تاریخ وثقافت)، جلد دوم از فواد محمد سزگین، مترجم جناب شیخ نذیر حسین، متوسط سے قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۱۰۵، قیمت ۲۲۵ روپے، پتہ: کوآپر ابک شاپ اینڈ گیلری،، شاہراہ قائد اعظم، لاہور، پاکستان۔

جرمن مستشرق بروکلمان کی عظیم الشان تاریخ ادبیات عربی اور اس پر ترکی فاضل فواد سزگین کی نظر ثانی اور ان کے حواشی سے آراستہ کتاب "التراث العربی" علمی وتحقیقی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، ریاض سعودی عرب کی جامعہ محمد بن سعود نے اس کتاب کے عربی ترجمہ کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے، پہلی جلد علوم القرآن پر مشتمل تھی، اس کو جناب شیخ نذیر حسین نے اردو قالب عطا کیا تھا، ان صفحات میں اس کا ذکر آچکا ہے، اب فاضل مترجم نے زیر نظر دوسری جلد کی شکل میں اردو دنیا کو ایک اور قیمتی تحفہ پیش کیا ہے۔ بنو امیہ و بنو عباس کے عہد اور شام، عراق، ایران، مصر، مراکش اور اندلس کے تقریباً تمام نامور مورخین ومصنفین کے اس جامع مرقع میں ایک فصل ثقافتی تاریخ پر بھی ہے۔ شروع میں ترکی محقق نے عربوں کی تاریخ نویسی کا فاضلانہ جائزہ بھی لیا ہے، ایک اور اہم باب بنو امیہ و بنو عباس کے زمانہ کے سیرت نگاروں سے متعلق ہے، اس کے متعلق فاضل مترجم کا یہ خیال درست ہے کہ اسکی بعض معلومات سے سیرت النبی پر اردو کی عام کتابیں خالی ہیں، انہوں نے کہیں کہیں ضروری اضافے بھی کیے ہیں، مثلاً معمر بن راشد کے تذکرہ میں مصنف عبدالرزاق کا ذکر ہے،

انہوں نے اس جگہ مولانا حبیب الرحمن اعظمی کی مصنف مطبوعہ بیروت کا حوالہ بھی دیا ہے اسی طرح واقدی کی کتاب الردہ کے طبع نو نیز علامہ محمد بن یوسف الصالحی الشامی کی کتاب سبل الهدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد وغیرہ کے متعلق بھی ضروری حواشی دیدیے ہیں، ترجمہ کی کامیابی کے لیے فاضل مترجم کا نام ہی کافی ہے البتہ کمپیوٹر کی کتابت کے اغلاط خاصے ہیں، یقیناً اردو داں طبقہ اس کتاب کے لیے فاضل مترجم کا مرہونِ منت رہے گا۔

ہجرتِ مصطفیٰ ؐ از مولانا علاء الدین ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۴۳، قیمت ۹۲ روپے، پتہ: ندوی بک ڈپو، ندوۃ العلماء لکھنؤ ۲۲۶۰۰۷، دارالکتب، دیوبند ۲۴۷۵۵۴۔

ہجرت نبوی ؐ، سیرت طیبہ کا نہایت اہم واقعہ ہے سیرت نگاران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اہمیت، اسباب و اثرات کا ذکر کیا ہے لیکن تاریخ انسانی کے اس انتہائی دوررس نتائج کا حامل یہ واقعہ بجائے خود مفصل مطالعہ کا متقاضی ہے، گذشتہ دنوں انگریزی میں اس موضوع پر ڈاکٹر ظفر الاسلام کی محققانہ کتاب "ہجرہ" کے نام سے شایع ہوئی اور اب زیر نظر کتاب میں ندوۃ العلماء کے ایک ہونہار جواں سال فاضل نے شرح و بسط سے بحث کی ہے، بائیس ابواب کے سینکڑوں ذیلی عناوین سے ہی ان کے مطالعہ و محنت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، ہجرت مدینہ نیز طائف و حبشہ کی ہجرت کے علاوہ انہوں نے بعض انبیائے کرام کی ہجرتوں کا ذکر اس حقیقت کے پیش نظر ضروری سمجھا کہ "ہجرت اس کائنات ارضی کی سنت، دعوتی و انقلابی زندگی کا مقدر اور کشمکش حق و باطل کا لازمی نتیجہ ہے"۔ اسلوب و بیان دلکش و موثر ہے، آہنگ عموماً خطیبانہ ہے،

جس سے وفور جوش کے ساتھ تکرار مباحث کا احساس ہوتا ہے اور یہ دانستہ وشعوری ہے جیسا کہ پیش لفظ میں اس کا جواز پیش کیا گیا ہے لیکن زبان پر اور توجہ کی ضرورت تھی بغیر کی بجائے بنا کا استعمال نا روا ہے بیج لگا گئی، غبار جھاڑیے وغیرہ درست نہیں۔ کتاب کے ضمیمہ میں ہجرت و متعلقات ہجرت کا جامع چارٹ پیش کیا گیا ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مقدمہ سے بھی کتاب مزین ہے۔

تاریخ مشرب شطار از جناب ڈاکٹر فضیل احمد قادری، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۷۲، قیمت ۸۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲۔

تاریخ تصوف میں سلسلہ شطاریہ اپنی روحانی خصوصیات کی وجہ سے ممتاز و مقبول تصور کیا جاتا ہے ہندوستان میں یہ سلسلہ قریباً پانچ سو سال پہلے شاہ عبداللہ شطاری کے ذریعہ رائج ہوا جس کے اثرات ہندوستان کے علاوہ بیرونی علاقوں میں بھی نظر آتے ہیں تاہم شیخ قاضن شطاری، حضرت بینادل جونپوری، شیخ محمد غوث گوالیاری اور شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی جیسے کبار مشائخ شطاریہ کے باوجود اس سلسلہ کی اہمیت اور اس کے بزرگوں کے سوانح سے نسبتاً کم اعتنائی کا احساس ہوتا ہے، زیر نظر کتاب میں فاضل مصنف نے اس کمی کی تلافی کی ہے، وہ خود ایک ممتاز صوفی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں، دوران حصول علم ان کا خاص موضوع تصوف تھا، علی گڑھ میں ایم فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے ان کے موضوعات کا تعلق بھی تصوف سے رہا، اس کتاب میں انہوں نے چار ابواب میں سلسلہ شطاریہ کے دور اول بہار اور بیرون ہند کے اکابر اور سلسلہ کے عہد زریں کا احاطہ کیا ہے خصوصاً شیخ قاضن شطاری اور ان کی اولاد و احفاد کے حالات انہوں نے بعض بیش قیمت مخطوطات کی مدد سے قلم بند کیے اور یہ اس کتاب کا نمایاں پہلو ہے، ایک حصہ میں سلسلہ شطاریہ

کے فکر و نظر اور اس کی روحانی و اخلاقی تعلیمات کو بیان کیا گیا ہے، چند اہم ضمیمے بھی شامل کیے گئے ہیں، مباحث میں مطالعہ و تجزیہ کے علاوہ اصابت رائے کی خوبیاں نمایاں ہیں، پیش لفظ جناب خلیق احمد نظامی مرحوم کے قلم سے ہے جنھوں نے اپنے شاگرد رشید کی اس کاوش کے متعلق لکھا کہ ”۔۔۔ صرف روحانی سلاسل کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے ہی نہیں بلکہ ہندی قرون وسطی کے طالب علم بھی اس سے مستفید ہوں گے۔“

حیاتِ بقا

از جناب محمد مظہر بقا، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۳۲، قیمت درج نہیں، پتہ: بقا پرنٹرز اینڈ پبلیشرز اے۔۵، پہلی منزل ہاشمی ٹرسٹ بلڈنگ، اردو بازار کراچی۔

اس خود نوشت کے سوانح نگار اردو و عربی زبان کی کئی کتابوں کے مولف و مترجم ہیں، اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ ان کی معروف تصنیف ہے لیکن زیر نظر کتاب کے آغاز میں انہوں نے خاکساری و کسر نفسی سے یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ کسی ایسی منفرد و ممتاز شان و شناخت کے حامل نہیں جو باعث سوانح نگاری ہو، مقصد صرف یہ ہے کہ ان کی آیندہ نسل کے لیے یادوں کا کچھ سرمایہ باقی و محفوظ رکھ دیا جائے اس اعتراف کے باوجود یہ کتاب شگفتہ و بے تکلفانہ اسلوب کے باعث دوسروں کے لیے بار خاطر نہیں ہے، یادوں کے اس مرقع میں کہیں کہیں افسانوی رنگ غالب ہے جس سے داستان گوئی کی لذت حاصل ہو جاتی ہے، نام و نسب کے سلسلہ میں والد مرحوم سے ان کا مکالمہ ان کی ذہنی و نفسیاتی رد و کد کا غماز ہے، علمی زندگی کا باب ذرا مفصل ہے اور شاید اسی کو سامان عبرت و موعظت بنایا گیا ہے، یہ سفر ٹونک کی ایک شرعی عدالت میں مفتی کی حیثیت سے شروع ہوا اور پاکستان میں کراچی یونیورسٹی کی پروفیسری سے جامعہ ام القری مکہ مکرمہ کی ملازمت تک پہونچا، اس طویل سفر کے نشیب و فراز میں حوصلہ مندوں کے لیے واقعی کچھ آثار و نقوش بڑے روشن ہیں، علمی زندگی کے ساتھ خواب بھی بکثرت بیان کیے گئے ہیں، جناب سید محمد ابوالخیر کشفی نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ”مولانا مظہر بقا بھی ایک عجوبہ ہیں کہ مولوی ہوتے ہوئے بھی تخلیقی اور زندہ نثر لکھتے ہیں۔“

ع۔ ص۔